اسبابِ زوالِ امّت

ناشران

یزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

۲۷۔بی۔شاہ عالم مارکیٹ۔لاہور

Re. 1

بار دوم — تعداد پانچ ہزار

MAILSI
TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY
Masood Faisal Jhandir Library

باسمہ تعالیٰ

اسبابِ زوالِ امت

(طبع سوم)

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

شائع کردہ میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ - لاہور

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (۱۷۶)

انہیں ان کی داستان سناؤ تاکہ یہ سوچیں (کہ ہمیں کیا ہو گیا)

داستان

آدم جنت میں تھا ابلیس نے اسے فریب دیا اور وہ جنت سے نکالا گیا۔

یہ ہے ہماری داستان

ایک سوال

اب سوال یہ ہے کہ جنت سے نکلا ہوا آدم، پھر سے جنت میں کس طرح جا سکتا ہے؟

اسکا جواب

اِس کا جواب بھی قرآن میں ہے اور وہی جواب آیندہ صفحات میں آپ کے سامنے آئے گا۔

شاید کہ خود را باز آفرینی!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

طبع اوّل

مارچ ۱۹۴۹ء کے "طلوع اسلام" میں "ایک اہم سوال" کے عنوان سے حسب ذیل سطور شائع ہوئی تھیں۔

"بعض حقیقتیں بہت تلخ ہوتی ہیں اور انسانی طبائع ان پر غور و فکر کرنے سے اس لئے گریز کرتی ہیں کہ اس سے جن نتائج تک پہنچا جاتا ہے وہ خوش آیند نہیں ہوتے۔ لیکن کوئی حقیقت محض اس لئے اپنے نتائج نہیں بدل دیا کرتی کہ آپ اس پر غور و فکر نہیں کرنا چاہتے۔ حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے، اور جب تک آپ اس کا بے نقاب تجزیہ کر کے ان اسباب وعلل کا ازالہ نہیں کرتے جو اس کا موجب ہیں، آپ ان نتائج سے بچ نہیں سکتے

خواہ آپ کو یہ کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔

"آج ہم ایک ایسی حقیقت کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں جس پر غور و فکر کرنے سے آپ کی طبیعت یقیناً گریز کرے گی۔ اس لئے کہ اس غور و فکر سے آپ جن نتائج پر پہنچیں گے، وہ آپ کے لئے خوش آئند نہیں ہوں گے۔ لیکن ان نتائج و عواقب کی ہلاکت سامانیوں سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ اس حقیقت پر غور و تدبر کو ٹالا نہ جائے۔ اگر اس پر اس سے پہلے غور کیا جاتا تو ممکن ہے اس وقت حالات ایسے خراب نہ ہوتے۔ اور اگر اس پر اب بھی غور نہ کیا گیا تو حالات یقیناً خراب تر ہوتے جائیں گے۔ یہ سوال بہت اہم ہے اس لئے بڑے گہرے مطالعہ اور تفکر کا محتاج۔

"آج دنیا کے اکثر حصوں میں مسلمانوں کی آبادیاں ہیں۔ ان کی مجموعی تعداد کوئی چالیس کروڑ بتاتا ہے کوئی اس سے بھی زیادہ۔ تعداد کچھ بھی ہو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ پاکستان بلکہ انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک، زمین کے مختلف حصّوں میں ان کی ایسی آبادیاں ہیں جو ہر دیکھنے والے کو نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہیں۔ ان میں یکسر آزاد حکومتیں بھی ہیں اور نیم آزاد بھی۔ محکوم بھی ہیں اور نیم محکوم بھی۔ خالص مسلمانوں کی آبادیاں بھی ہیں اور مخلوط بھی۔ یہ سب کچھ ہے۔ لیکن اُن کی حالت کیا ہے؟

"جو آزاد مملکتیں ہیں وہ غیر مسلموں کی آزاد مملکتوں کے مقابلے میں

بہت کمزور بلکہ ذلیل ہیں۔ افغانستان، ایران، حجاز، شام، مصر وغیرہ حکومتیں یورپ کی غیر مسلم حکومتوں کے مقابلہ میں نہ صرف کمزور ہیں بلکہ ان کا وجود درحقیقت ان کے رحم وکرم پر ہے۔ یورپ کی غیر مسلم حکومتوں کی سیاسی مصلحتیں انہیں جس انداز اور جس حالت میں رکھنا چاہیں، انہیں ویسے ہی رہنا پڑتا ہے۔ یہ وہ انگور کی بیلیں ہیں جو اُن شاہ بلوط کے درختوں کے سہارے کھڑی ہیں۔ اِن کی سیاست کی کٹھ پتلیاں (داخلی اور خارجی ہر دو) اُن کے اشاراتِ ابرو پر ناچتی ہیں۔ گذشتہ جنگ عالمگیر میں ان میں سے ہر مملکت، سہمی اور دبکی ہوئی دن گزار رہی، اور اس طرح اقوام مغرب کی طاقتوں کے سائے میں یوں پناہیں ڈھونڈھ رہی تھی، جس طرح چیل کے سائے سے ڈر کر مرغی کے بچے مرغی کے نیچے دبک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جنگ کے بعد، دنیا کے اہم معاملات کے فیصلے یورپ اور امریکہ کے اکابر ثلاثہ (The Big Three) یا ابطال خمسہ (The big Five) کے مشوروں ہی سے طے پا رہے ہیں جو غیر مسلم اقوام کے نمائندے ہیں۔ مسلم حکومتوں کو انہوں نے محض آرا شماری کے وقت اپنی تقویت و تائید کے لئے پیچھے لگا رکھا ہے۔ اتحاد اقوام اسلامی (Pan Islamism) کا جو ہوّا ایک عرصہ سے غیر مسلم اقوام کے لئے ذہنی طور پر خوف و رعب کا باعث بن رہا تھا، اس کا بھانڈا فلسطین کے چوراہے میں اس بری طرح سے

پھوٹا ہے کہ ہر نگہ، حساس زمین میں گڑ گئی ہے۔ اُدھر انڈونیشیا میں دیکھئے[1]
یورپ کے مٹھی بھر گوالے، سات سمندر پار سے آکر، سات کروڑ مسلمانوں کا گلا
ایسے آہنی پنجوں سے دبا رہے ہیں کہ ان کی آواز تک نہیں نکلنے پاتی۔ اس سارے
خلفشار میں، صرف ترکی ایک ایسا ملک نظر آتا ہے جس نے اقوام مغرب کے
مقابلہ میں اپنے آپ کو سنبھالے رکھا ہے۔ لیکن اس نے بھی اپنے آپ کو
محض سنبھالے ہی رکھا ہے۔ ائمۂ اقوامِ عالم میں اس کا بھی شمار نہیں۔ اس وقت
قوموں کی امامت، اقوام یورپ اور امریکہ ہی کے حصہ میں ہے۔

"مخلوط آبادیوں میں (مثلاً روس کو لیجئے۔ وہاں مسلمانوں کی خاصی
آبادی ہے لیکن وہاں کی حکومت کے کاروبار میں ان کا حصہ کہیں نمایاں
نظر نہیں آتا۔ وہ بھی غیر مسلم روسیوں کے رحم و کرم پر ہی زندہ ہیں۔ حتیٰ کہ
چین جیسا ملک، جو ممالک عالم میں نہایت پست درجہ شمار ہوتا ہے وہاں
بھی یہ حالت ہے کہ کبھی مسلمانوں کا نام اُبھر کر سامنے نہیں آتا۔ یورپ کے
کئی ایک حصوں میں مسلمان (مخلوط طور پر) آباد ہیں۔ لیکن تگ و تازِ
حیات میں ان کے چرچے کبھی سنائی نہیں دیئے۔

"اب اپنے گھر میں آیئے۔ کل تک مسلمان اور ہندو، ہندوستان
میں انگریزوں کے محکوم تھے۔ لیکن مسلمان انگریز کا بھی محکوم تھا
اور ہندو کا بھی۔ زندگی کے ہر شعبہ میں، ہم اپنے آپ کو ہندوؤں سے

---

[1] بحمد اللہ انڈونیشیا اب آزاد ہو چکا ہے۔

بہت پیچھے پلتے تھے۔ آج بھی وہاں قریب ۲ کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ ان پر جو کچھ گزر رہی ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ مملکتِ پاکستان بالکل نوزائیدہ ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اس کے متعلق ابھی کوئی حتمی رائے قائم کرنا قبل از وقت ہے۔ لیکن ہمارے انفرادی اور قومی خصائص و اوصاف تو ہمارے سامنے ہیں۔ ان کی روشنی میں ہم اپنے متعلق کچھ نہ کچھ رائے تو قائم کر ہی سکتے ہیں۔ اور وہ رائے کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔

"یہ ہیں وہ واقعات جن میں سے کسی ایک کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان پر ایک مرتبہ پھر نگاہ ڈال لیجئے کہ کہیں کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی؟

"اب آگے بڑھیئے! مسلمانوں کی یہ آبادیاں دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ایک دوسرے سے اُن کے جغرافیائی حالات مختلف ہیں۔ آب و ہوا مختلف ہے۔ طرزِ بود و ماند مختلف ہے۔ زبانیں مختلف ہیں۔ طبائع مختلف ہیں۔ ان میں قدرِ مشترک ہے تو صرف ایک۔ یعنی ان کا مذہب۔

"اب آپ یہ سوچئے کہ اگر ایک غیر مسلم مبصّر، حالات کے اس تجزیہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ اقوامِ عالم کے مقابلہ میں مسلمانوں کی پستی اور ان کی ذلت کا باعث ان کا مذہب ہے، تو آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟

اِس میں ناک بھوں چڑھانے کی کوئی بات نہیں۔ لاحول پڑھنے کا کوئی مقام نہیں۔ اگر آپ کو یہ تسلیم ہے کہ واقعات وہی ہیں جو اوپر لکھے گئے ہیں اور حالات ایسے ہی ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، تو اس غیر مسلم کے اس سوال کا جواب ہمارے ذمے ہے۔ اس طبقہ کی طرف سے، جس نے ایک مدّت سے حقائق سے چشم پوشی اختیار کر رکھی ہے، اس سوال کا (بزعم خویش) بڑا آسان جواب یہ دیا جائے گا کہ مسلمانوں نے چونکہ مذہب کو چھوڑ رکھا ہے اس لئے یہ اس درجہ ذلیل وخوار ہو رہے ہیں۔ لیکن یہ جواب خود انہیں تو مطمئن کر سکتا ہے، حقائق کو بے نقاب دیکھنے والوں کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر انہوں نے مذہب کو چھوڑ دیا ہے تو غیر مسلم اقوام مغرب نے کونسا مذہب کو پلّے باندھ رکھا ہے۔ انہوں نے ان سے بھی پہلے اور ان سے کہیں شدید تر انداز سے مذہب کو چھوڑا ہوا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں دونوں یکساں ہو گئے۔ پھر وہ کونسی بات ہے جس کی وجہ سے غیر مسلم اقوام اس قدر طاقتور ہیں، اور مسلم اقوام، دُنیا کے ہر گوشے میں کمزور اور ذلیل ہیں۔ پھر یہ بھی کہ بالآخر ایسے مسلمان بھی تو ہیں جنہوں نے مذہب کو نہیں چھوڑا۔ اُن کی حالت کونسی اچھی ہے!

"یہ سوالات ایسے ہیں جو تاریخ وسیاست کے ہر طالب علم کے سامنے آتے ہیں۔ آپ ان سے گھبرائیے نہیں۔ ان پر غور وفکر کیجئے۔ جب تک

آپ ان پر آزادانہ غور نہیں کریں گے حقیقتِ حال تک نہیں پہنچ سکیں گے، اور جب تک آپ اصلِ حقیقت تک نہیں پہنچیں گے، اپنی موجودہ حالت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکیں گے۔

"آپ سوچیے اور جو جواب آپ کی سمجھ میں آئے ہمیں لکھ بھیجیے (لیکن مختصر طور پر لکھئے) سوچیے اور جواب لکھتے وقت اپنے دل میں کوئی چور نہ رکھئے۔ اس سے نہ ڈریئے کہ کوئی آپ کو کیا کہے گا۔ آپ غور و فکر کا نتیجہ دوسروں کے سامنے آنے دیجئے۔ شاید اس طرح سے ہم اس حقیقت تک پہنچ جائیں جو ایک عرصہ سے ہماری نگاہوں سے گم ہو رہی ہے اور جس کی وجہ سے ہمارا ہر قدم پیچھے کی طرف اُٹھ رہا ہے۔

"طلوعِ اسلام" ہر صاحبِ فکر کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اس اہم سوال پر غور کرے اور اپنے نتیجۂ تدبر سے ہمیں اطلاع دے۔ ہم کوشش کریں گے کہ ان نتائجِ فکر کو بے کم و کاست شائع کریں اور آخر میں اُن پر محاکمہ کر کے کسی صحیح نتیجہ تک پہنچ سکیں۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ۔"

اس اہم سوال کے، مختلف اربابِ فکر کی طرف سے، جوابات موصول ہوئے جو طلوعِ اسلام میں برابر شائع ہوتے رہے اور قریب ایک سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس عرصہ میں ناظرینِ طلوعِ اسلام برابر منتظر رہے کہ

اس اہم موضوع پر محترم پرویز صاحب قرآن کریم کی روشنی میں ملت کی راہنمائی فرمائیں اور بتائیں کہ قرآن کریم کی رُو سے مسلمانوں کے زوال و انحطاط کے اسباب کیا ہیں؟ موجودہ دور میں چونکہ محترم پرویز صاحب ہی دعوت الی القرآن کے سب سے بڑے نقیب ہیں اور قرآن نے قوموں کے عروج و زوال کے جو اٹل قوانین بیان کئے ہیں انہوں نے ان کا بغائر مطالعہ کیا ہے۔ نیز اقوام و ملل عالم کی تاریخ پر بھی ان کی نگاہ بڑی دور رس واقع ہوئی ہے اس لئے اگر ملت ان کی راہ نمائی کے لئے چشم براہ تھی تو وہ بڑی حد تک حق بجانب بھی تھی۔

محترم پرویز صاحب اپنی دفتری ذمہ داریوں کے علاوہ معارف القرآن کی تکمیل، لغات القرآن اور ترجمۂ قرآن کی ترتیب و تدوین اور دیگر اجتماعی مقاصد میں اس قدر مصروف تھے کہ وہ مسلسل تقاضوں کے باوجود اس طرف جلد توجہ نہ دے سکے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ تقاضے اس قدر شدید ہو گئے کہ انہیں اس کے لئے وقت نکالنا ناگزیر ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے اس اہم موضوع پر ایک گراں قدر مقالہ سپرد قلم فرما کر طلوع اسلام کو مرحمت فرما دیا جس میں انہوں نے تقریباً ان تمام گوشوں کا احاطہ فرما لیا ہے جو کسی نہ کسی نہج سے ملت کے زوال و انحطاط کا سبب بنے تھے۔

اگر مسلمانوں کی واقعی یہ خواہش ہے کہ انہیں پھر نشاۃ ثانیہ نصیب

ہو سکے تو ان کے لئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ وہ اپنے زوال و انحطاط اور ذلت و نکبت کے اسباب و وجوہ کو سمجھ لیں تاکہ وہ سوچ سمجھ کر آیندہ کوئی قدم اٹھا سکیں۔ اس مقصد کے لئے محترم پرویز صاحب کے اس گراں قدر مقالہ کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ صرف مطالعہ ہی نہیں بلکہ پورے غور و فکر اور غائر تدبّر و تفکر کے ساتھ ان تمام تلخ حقیقتوں کو ایک مرتبہ ٹھنڈے دل کے ساتھ سمجھ لینا انتہائی ضروری ہے جو ماضی میں ملّت کے عروج کو مبدل بہ زوال کر چکی ہیں۔ تاکہ ان پستیوں سے نکل کر بلندیوں کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے دوبارہ ان خوفناک غلطیوں کا اعادہ نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ ملّت جس راہ پر چلتے چلتے اس قعرِ زوال تک پہنچی ہے یقیناً اس میں کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ضرور ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ راستہ ہی غلط ہو اور ممکن ہے کہ وہ غلطی ہماری اپنی رفتار میں ہو لیکن اتنی بات بالکل یقینی ہے جس سے کوئی باشعور انسان جسارتاً انکار نہیں کر سکتا کہ کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ہے، اور ضرور ہے۔ لہٰذا اسبابِ زوال کا اگر واقعی کھوج لگانا ہے تو آپ کو اپنی اس شاہراہ اور روشِ عامہ پر تنقیدی نگاہ ڈالنی پڑے گی جس پر ہم ہزار سال سے چلتے آرہے ہیں۔ جن لوگوں کے دل میں ملّت کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے کوئی تڑپ موجود ہے ان کے لئے اس کے سوا کوئی دوسری راہِ عمل ہو ہی نہیں سکتی۔

یقیناً اس مقالہ میں آپ کو ایسی چیزیں بھی ملیں گی جو عام شاہراہ سے ہٹی ہوئی یا ہماری عام روش سے الگ ہیں۔ یہی وہ تاریخی موڑ ہیں جہاں ہمیں کچھ دیر کے لئے ٹھہر کر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ دیکھئے کہ مقالہ نگار جس نکتہ کی طرف ہماری راہنمائی کر رہا ہے اس کے پاس اس کے لئے کوئی سند بھی ہے یا نہیں۔ اگر وہ آپ کے سامنے قرآنی سند پیش کر رہا ہے تو محض مَا اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ اٰبَاءَنَا کی جاہلانہ ضد آپ کی راہ میں حائل نہیں ہونی چاہیئے۔

محترم پرویز صاحب کا یہ گرانقدر مقالہ جنوری و فروری ۱۹۵۰ء کے طلوع اسلام کے صفحات پر پیش کیا گیا۔ تقاضوں کے پیش نظر اس اشاعت کی کافی زیادہ تعداد طبع کرائی گئی تھی مگر اس مقالہ کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ چند دنوں ہی میں تمام کاپیاں ختم ہو گئیں۔ کچھ احباب نے اسے الگ پمفلٹ کی شکل میں بھی طبع کرایا۔ مگر بڑھتی ہوئی مانگ کو وہ بھی پورا نہ کر سکا۔ بالآخر ۱۹۵۲ء میں محترم موصوف کی نظر ثانی اور جدید اضافات کے بعد طلوع اسلام ہی میں اس مقالہ کو دوبارہ شائع کرنا پڑا۔ اس مرتبہ یہ مقالہ پہلے سے بھی زیادہ تعداد میں طبع کرایا گیا تھا مگر وہ بھی بہت جلد ختم ہو گیا۔ آج دفتر میں اس دوسرے نمبر کی بھی کوئی کاپی موجود نہیں اور ادارہ کو نہایت افسوس کے ساتھ فرمائشوں کی تعمیل سے معذرت کرنی پڑ رہی ہے۔ اب کچھ عرصہ سے یہ مطالبہ ہو رہا تھا کہ

اس مقالہ کو تیسری مرتبہ کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے۔ ہمیں مسرت ہے کہ ہم محترم موصوف کی نظرِ ثالث کے بعد اس محققانہ مقالہ کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اسکا مطالعہ قوم کے قلب و نگاہ میں وہ تبدیلی پیدا کر دے گا جو دنیا میں قرآنی انقلاب کا پیش خیمہ ہو گی۔ یہ ہمارے دور کی سعادت ہے کہ اس میں ایک ایسا قرآنی مفکر موجود ہے جس نے وہ نشاناتِ راہ متعین کر دیئے ہیں جو ہمیں پھر سے اس منزل کی طرف لیجا سکتے ہیں جو کاروانِ انسانیت کے لئے منتہائے مقصود ہے۔

والسلام

(ناظم ادارہ طلوع اسلام) [کراچی ۱۹۵۲ء]

دیباچہ

طبع دوم

یہ کتابچہ ۱۹۵۳ء میں چھپا تھا۔ ہمیں خوشی ہوئی کہ اس نے نہ صرف مقبولیت حاصل کی بلکہ ایسا گہرا اثر پیدا کیا کہ آج ہم میں ایک اچھا خاصا طبقہ ایسا موجود ہے جو انہی خطوط پر سوچتا ہے، جنہیں مصنف نے اس مقالہ میں پیش کیا تھا اور اپنے امراض کا علاج بھی اسی نسخہ میں پاتا ہے جو اس میں تجویز کیا گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مقالہ، قرآنی انقلاب کے لئے بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتا ہے، جس پر فکر ونظر کی ایک جدید عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس کتابچہ کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا تھا۔ اب اسے مصنف کی نظرِ ثانی کے بعد دوبارہ شائع کیا جاتا ہے۔ ادارہ طلوع اسلام کے لئے اس امر کا احساس باعثِ مسرت و افتخار ہے کہ اس نے قرآنی لٹریچر کی اشاعت کے لئے جو قدم اٹھایا تھا وہ ملک میں صحیح انقلاب کا پیش خیمہ بن رہا ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

[کراچی ۱۹۵۶ء]

دیباچہ

(طبع سوم)

محترم پرویز صاحب کی یہ مختصر سی کتاب، جو اُن کے قرآنی فکر میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے، ملک کے خواص و عوام، دونوں کی طرف سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ اس میں ہماری ملت کے مرض کی تشخیص ایسی حاذقانہ انداز سے کی گئی ہے کہ اس کے بعد، علاج کا مرحلہ چنداں مشکل نہیں رہتا۔ اس کے دوسرے ایڈیشن کے ختم ہو جانے کے بعد، اس کی مقبولیت کے پیش نظر، اس کا تیسرا ایڈیشن، مصنف کی نظر ثانی کے بعد شائع کیا جاتا ہے۔ اس دفعہ اس کی اشاعت کی سعادت ہمارے حصہ میں آئی ہے۔ پہلے یہ کتاب اعلیٰ کاغذ پر شائع ہوتی رہی ہے جس کی قیمت دو روپے تھی لیکن عوام کے تقاضے کے پیش نظر اب ہلکے کاغذ پر شائع کیا جا رہا ہے اس لحاظ سے اسکی قیمت صرف ایک روپیہ رکھی گئی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ احباب اس سے استفادہ کر سکیں۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ والسلام

(میاں) عبدالخالق۔ آنریری منیجنگ ڈائریکٹر

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

فروری سنہ ۱۹۶۲ء

۲۷-بی شاہ عالم مارکیٹ ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسبابِ زوالِ اُمّت

(پرویز)

چہ گویمت کہ چہ بودی، چہ کردۂ، چہ شدی
کہ خوں کند جگرم را ایازیِ محمود
تو آں نۂ کہ مصلّے ز کہکشاں می کرد!
شرابِ صوفی و شاعر ترا ز خویش ربود!

طلوعِ اسلام نے اپنی اشاعت بابت مارچ ۱۹۴۳ء میں "ایک اہم سوال" کے عنوان سے ایک ایسی بحث کا آغاز کیا جس کی اہمیت میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ سوال مختصر الفاظ میں یہ تھا کہ مسلمان دنیا میں

جہاں کہیں آباد ہیں، غیر مسلموں کے مقابلہ میں ان کی حالت پست و زبوں ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ بالآخر ایسا کیوں ہے؟ اس کے بعد طلوعِ اسلام نے یہ لکھا تھا کہ

> اب آپ سوچیئے کہ اگر ایک غیر مسلم مبصّر، حالات کے تجزیہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ اقوامِ عالم کے مقابلہ میں مسلمانوں کی پستی اور ذلت کا باعث ان کا مذہب ہے تو آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟

اس کے بعد طلوعِ اسلام نے تمام اربابِ فکر و نظر کو دعوت دی تھی کہ وہ وقت کے اس اہم سوال پر غور کریں اور اپنے نتائج فکر و تدبر سے طلوعِ اسلام کو مطلع فرمائیں۔ تاکہ انہیں طلوعِ اسلام میں شائع کر کے کسی آخری نتیجہ پر پہنچا جا سکے۔ چنانچہ اس سوال کے جواب میں مختلف گوشوں سے جو کچھ طلوعِ اسلام میں شائع ہوتا رہا، میں اس کا بغائر مطالعہ کرتا رہا اس لئے کہ سوال زیرِ غور وہ تھا جس نے مجھے خود ایک عرصہ سے طلسمِ پیچ و تاب بنا رکھا تھا اور میں چاہتا تھا کہ کسی صاحبِ فکر کی طرف سے اس کا کھلا کھلا جواب میرے سامنے آ سکے۔ طلوعِ اسلام میں اس ضمن میں جو کچھ اس وقت تک شائع ہوا ہے اس کا بیشتر حصّہ تو اسی انداز کا ہے کہ چونکہ مسلمانوں نے اپنا مذہب چھوڑ رکھا ہے اس لئے ان کی حالت

اس قدر پست و ذلیل ہو گئی ہے۔ حالانکہ اس جواب کے متعلق طلوع اسلام نے شروع ہی میں لکھ دیا تھا کہ

یہ جواب حقائق کو بے نقاب دیکھنے والوں کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر مسلمانوں نے مذہب کو چھوڑ رکھا ہے تو غیر مسلم اقوامِ مغرب نے مذہب کو کب پلّے باندھ رکھا ہے۔ انہوں نے اس سے بھی پہلے اور ان سے کہیں شدید تر انداز سے مذہب کو چھوڑ رکھا ہے۔ اس لئے اس صورت میں دونوں یکساں ہو گئے۔ پھر وہ کونسی بات ہے جس کی وجہ سے مسلمان دنیا کے ہر گوشے میں کمزور اور ذلیل ہیں۔ پھر یہ بھی کہ بالآخر ایسے مسلمان بھی تو ہیں جنہوں نے مذہب کو نہیں چھوڑا اُن کی حالت کون سی اچھی ہے؟

اس دوران میں اکثر حضرات نے براہ راست مجھ سے اور بعض نے طلوع اسلام کی وساطت سے پوچھا کہ میں اس باب میں کیوں خاموش ہوں؟ استفسار کرنے والے تقاضے، اور تقاضوں نے اصرار و تکرار کی صورت اختیار کی۔ میں ان تقاضوں کے جواب میں بھی خاموش تھا۔ اور جب، بعض احباب کا اصرار لب کشائی پر مجبور ہی کر دیتا تو اتنا کہہ کر چپ ہو جاتا تھا کہ

داستانِ ادمپرس از من کہ من   چوں بگویم آنچہ ناید در سخن

در گلویم گریہ ھا گردد گرہ　　این قیامت اندرونِ سینہ بہ

یہ نہیں کہ اِس سوال کے جواب میں میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، یہ سوال ایک عرصے سے خود میرے سامنے تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اِسی ایک سوال پر کیا منحصر ہے۔ میری تو ساری عمر اس اجمال کی تفصیل ہے کہ

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی، کبھی پیچ و تابِ رازی

لیکن اس سوال کے جواب میں جو دشواری میرے گلوگیر ہو رہی تھی وہ یہ خیال تھا کہ میری بصیرتِ قرآنی نے مجھے جس نتیجہ تک پہنچایا ہے مسلمان اسے سننے کے لئے ابھی تیار نہیں۔ علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

فرنگ ان کی نواؤں کی تاب لاسکا یا نہ، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہنوز مسلمان میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ ان نواؤں کی تاب لا سکے جو اس کی صحیح تصویر کو قرآن کے آئینہ میں بے نقاب دیکھ کر ایک قلبِ حساس سے فغان بن کر اٹھتی ہیں اور فضا کے سینے کو چیر کر آسمان سے جا ٹکراتی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے بڑی الم انگیز اور حدیث ہے بڑی جگر خراش کہ مسلمان اپنی اصلی تصویر دیکھنے کے لئے قطعاً تیار نہیں، وہ اُس حبشی کی طرح جس نے

آئینہ میں اپنی بھیانک شکل دیکھ کر آئینہ توڑ ڈالا تھا ہر اُس شخص کے پیچھے پڑ جاتا ہے جو اُسے اس کے حقیقی خط و خال سے آگاہ کرتا ہے۔ بہت دنوں کی بات ہے، دِلّی میں ایک بڈھے باپ کا اکلوتا جوان بیٹا فوت ہو گیا۔ فرطِ غم نے باپ کو پاگل کر دیا۔ وہ رات کو اُٹھا اور بیٹے کی لاش کو قبر سے نکال لایا۔ وہ لاش کو سینے سے لگائے لگائے پھر رہا تھا۔ جو شخص لاش کو چھڑانے کے لئے آگے بڑھتا وہ اسے چاقو دکھاتا، اور جو اس لاش کو مردہ کہتا وہ اسے پتھر مارتا۔ مسلمان نے بھی چند تصورات و رسوم کی لاشوں کو اپنے سینے سے لگا رکھا ہے۔ جو شخص ان لاشوں کو اس سے الگ کرنے کیلئے آگے بڑھتا ہے وہ اسے چاقو دکھاتا ہے۔ اور جو انہیں مردہ کہتا ہے وہ اسے پتھر مارتا ہے۔ میں نے عمر بھر اس کی کوشش کی ہے کہ جس انداز سے قرآن کریم کی روشنی نے یہ حقیقت مجھ پر بے نقاب کی ہے کہ جس جسدِ بے جان کو مسلمان محبوب جاں نواز سمجھ کر سینے سے لگائے لگائے پھر رہا ہے وہ ایک لاش سے زیادہ کچھ نہیں، اسی انداز سے اس حقیقت کو دوسروں کے سامنے بھی پیش کر دوں۔ اس لئے مجھے طلوع اسلام کے پیش کردہ سوال کے متعلق بھی اپنی قرآنی بصیرت کی روشنی میں کچھ عرض کرنے میں تامل نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ سوال ایسا تھا کہ میں جس مقام تک مسلمانوں کو آہستہ آہستہ، بتدریج پہنچانا چاہتا تھا، یہ ایک ہی جست میں انہیں اس کے سامنے

لاکھڑا کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے، میں اس باب میں، لب کشائی میں متامل تھا اور ہر بار اسی نتیجہ پر پہنچتا تھا کہ

اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

اس میں شبہ نہیں کہ جہاں ایک طرف، میرا یہ مسلک تدریج و امہال، مزید ضبط و انتظار کا متقاضی تھا، اور قدم قدم پر یہ کہہ کر عناں گیر ہو رہا تھا کہ

غمِ دل نگفتہ بہتر ہمہ کس جگر ندارد

وہاں، دوسری طرف، کیفیت یہ تھی کہ میں جب ان جوابات کو دیکھتا جو طلوعِ اسلام میں شائع ہو رہے تھے تو اس احساس سے کہ

عرب کہ باز دہد محفلِ شبانہ کجاست ... عجم کہ زندہ کند دورِ عاشقانہ کجا ست؟

بزیرِ خرقۂ پیراں سبوچہ ہا خالی ... فغاں کہ کس نشناسد مئے جوانہ کجاست؟

میری بیتابیٔ تمنّا، تدریج و امہال کی مصلحت کوشیوں کو بالائے طاق رکھ دینے کے لئے کوندے کی طرح لپکتی، اور میں اس کے لئے تیار ہو جاتا کہ جو بات آخر میں جا کر کہنی ہے، اسے آج ہی کیوں نہ کہہ دوں۔ کہ بالآخر

از سینہ تا بجنبد بہ آرم فسردہ ام

ایں نیم قطرہ خوں کہ ز مژگاں چکیدنی ست

میں اسی کشمکش میں تھا کہ بعض قریب ترین احباب کا تقاضا اس نقطہ تک

آپہنچا جہاں —— بیاکہ من سپر انداختم —— کے سوا کچھ چارہ نہیں رہا کرتا۔ یہ ہے اِس محفلِ شوق میں میرے سب سے آخر میں پہنچنے کی داستان جبر و اختیار یعنی۔

اِی آہِ جگر سوزے در خلوتِ صحرا بہ
لیکن چہ کنم کارے با انجمنے دارم

اس مقام پر میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں جو کچھ آیندہ سطور میں پیش کروں گا، آپ اس سے متفق ہوں یا نہ، لیکن اتنا ضرور کیجئے کہ میری گزارشات پر ٹھنڈے دل سے غور کیجئے اور انہیں جذبات کی شعلہ فشانیوں کی نذر نہ کر دیجئے۔ اور دوسرے یہ کہ ان پر بنگاہِ تعمق غور کیجئے، کہ ان میں بہت سی باتیں شاید آپ کے سامنے پہلی مرتبہ آئیں، اور اُن پامال راہوں سے کچھ الگ راستے دکھائیں جن پر ہم آنکھیں بند کر کے چلنے کے خوگر ہو رہے ہیں۔

اور اگر آپ میری تشخیص سے متفق ہوں تو پھر سوچئے کہ اس مزمن مرض کے لئے جو علاج، قرآن نے تجویز کیا ہے اسے کس طرح، بلا مزید توقف عملاً شروع کیا جا سکتا ہے۔

اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى
وَ فُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۚ (۳۴/۴۶)

میں تمہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ تم دو دو ایک ایک کر کے اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ اور پھر سوچو (کہ قرآن جو کچھ کہتا ہے اس پر کس طرح عمل کیا جائے)

سوال زیرِ غور کی بنیاد اس دعوے پر ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں بھی مسلمان آباد ہیں وہ غیر مسلموں کے مقابلہ میں نکبت و زبوں حالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ دعویٰ ایک ایسی صداقت ہے جسے ہر جگہ بطور حقیقتِ ثابتہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس لئے اس دعوے کے اثبات کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ دسمبر ۱۹۴۹ء کی بات ہے۔ کراچی میں انٹرنیشنل اسلامک اکنامک کانفرنس (بین الملی اسلامی اقتصادی مؤتمر) کا انعقاد ہوا جس میں تمام اسلامی ممالک (یعنی مسلمانوں کی سلطنتوں) کے نمائندے جمع تھے۔ ان سے خطاب کرتے ہوئے محترم غلام محمد (مرحوم) نے (جو اس زمانے میں وزیرِ مالیات تھے) اپنے خطبۂ افتتاحیہ میں، اُن اقدار و عناصر کو ایک ایک کر کے گنایا جو دنیا کے مسلمانوں میں مشترک تھے۔ اس ضمن میں انہوں نے کہا:۔

چوتھا عنصر جو ہم میں بطور قدرِ مشترک موجود ہے، کچھ خوش آیند نہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم سب پست اقوام ہیں اور ترقی میں پس ماندہ۔

مغرب کے مقابلہ میں، جو صنعت و حرفت میں بڑا ترقی یافتہ ہے، ہم نا اہل ہیں اور ہمارا معیارِ زیست بڑا پست ہے۔ بعض اوقات تاسف انگیز حد تک پست۔ اور پانچواں عنصر جو اس سے بھی زیادہ ہماری بدبختی کا آئینہ دار ہے، یہ ہے کہ اگرچہ ہم سیاسی طور پر کم و بیش آزاد ہیں، اقتصادی طور پر ہم مغربی اقوام کے پنجۂ آہنی کی گرفت میں ہیں۔ اور اس سے تو آپ متفق ہوں گے کہ دوسروں کے مفاد، فیصلوں اور قوت کے سامنے اقتصادی زیردستی، آزادی نہیں۔ آزادی کے فریب اور نقاب میں چھپی ہوئی غلامی ہے۔ اسلئے ہم سب نہ ابھی کامل طور پر آزاد ہی ہیں اور نہ ہی اپنے گھروں کے آپ مالک۔

یہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے۔ لیکن اب ۱۹۶۲ء میں بھی ہماری حالت (اور ایک ہماری کیا، تمام دنیا کے مسلمانوں کی حالت) اس سے بہتر نہیں۔ آپ دیکھیے کہ وہ کونسا دن ہے اور کونسی تقریب، جس میں چار مسلمان اکٹھے ہوں اور اپنی زبوں حالی کی مرثیہ خوانی کرتے دکھائی نہ دیں۔ اپنی حالت پر یہ ماتم، ہماری زندگی کا معمول بن رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہ آئے کہ ہمارا حال ایسا کیوں ہو گیا ہے اور اس کی اصلاح کی صورت کیا ہے؟

عزت و ذلت کسے کہتے ہیں

اب ایک تنقیح طلب امر اور ہے۔ ہم نے کہا یہ ہے کہ مسلمان، قوت وثروت، دولت وحشمت، صنعت وحرفت اور سیاست ومملکت میں غیر مسلموں سے پیچھے اور اُن کا آستاں افتادہ ہے۔ اسے ہم نے اس کی نکبت وذلت سے تعبیر کیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ عزت اور ذلت کا یہ معیار ہی غلط ہے۔ یعنی جن چیزوں کا نام تم نے عزت رکھ چھوڑا ہے، اسلام انہیں وجہِ عزت قرار ہی نہیں دیتا۔ لہذا جب عزت اور ذلت کا یہ معیار ہی غلط ہے تو اس معیار پر مسلمانوں کی حالت کو پرکھنا اور اس پر پورا نہ اترنے پر انہیں پست وذلیل قرار دینا کیسے صحیح قرار پا سکتا ہے؛ چنانچہ مذہب پرست طبقہ کی طرف سے اس اعتراض کا جواب ہی یہ دیا جاتا ہے کہ "عزت سب خدا کے لئے ہے" اور خدا کے نزدیک سب سے زیادہ صاحبِ عزت وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے (اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ)، اور پرہیزگار (متقی) وہ ہے جو دُنیا کی آلودگیوں اور خباثتوں سے مجتنب رہے۔ دنیا کا مال و دولت فتنہ ہے۔ جس قدر انسان اس فتنے سے دور رہے وہ اسی قدر خدا کے قریب ہو جاتا ہے۔ سب سے زیادہ باخدا وہ ہے جو سب سے زیادہ دنیا سے کنارہ کش ہو۔ دنیا مُردار ہے اور اس کا طالب کُتا۔ مومن دنیا میں اس طرح رہتا ہے جس طرح جیل خانہ میں

قیدی۔ دنیاوی زیبائش و آرائش اور تحسین و تزئین حرام ہے، اور لذائذ و حظائظ مکروہات۔ دولت و قوّت قارونیت کی علامتیں ہیں اور غلبہ و تسلط فرعونیت کی سرکشی۔ لہٰذا جب یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ مسلمان ذلیل و خوار ہے، تو اس پر قائم کردہ عمارت بھی از بنیاد تا بام غلط ہے۔

میں اس موضوع پر اس سے پہلے اتنا کچھ لکھ چکا ہوں کہ اب کسی تفصیلی گفتگو کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ لیکن چونکہ دنیا اور اس کی کامیابیوں اور کامرانیوں کے متعلق یہ تصوّر "مذہب" کا پیدا کردہ ہے اور "دین" کی تعلیم کے یکسر خلاف[1] ہے۔ اس لئے اس کے بعض گوشوں کے متعلق کچھ مختصراً عرض کرنا ناگزیر ہے۔

انسان دنیا میں رہتا ہے، اور اُن قوانین طبیعی کے مطابق جن کے تابع ہر ذی حیات زندگی بسر کرتا ہے، اسے بھی زندہ رہنے کے لئے متاعِ دُنیا کی ضرورت ہے۔ روٹی۔ کپڑا۔ مکان۔ دیگر ضروریاتِ زندگی، ہر جینے والے کے لئے ضروری ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس سامانِ زلیست کا محتاجوں اور بھکاریوں کی طرح ملنا، سزاوارِ انسانیت ہے یا عزت و تکریم سے حاصل ہونا

---

[1] مذہب اور دین میں کیا فرق ہے؟ اس کے متعلق آگے چل کر تشریح کی جائیگی۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلام "دین" ہے۔ مذہب نہیں۔

وجہ شرف آدمیت؟ ہم سمجھتے ہیں کہ اس سوال کے صحیح جواب کے لئے نہ کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت ہے نہ ارسطو کی عقل کی۔ ہر ذی شعور انسان بشرطیکہ اس کی عقل پر کورانہ تقلید کے پردے نہ پڑ چکے ہوں اور وہ خود سوچنے کی صلاحیت نہ کھو بیٹھا ہو، بلا تامل کہہ دے گا کہ ذلت و رسوائی کی روٹی کے مقابلہ میں عزت و آبرو کا رزق ہزار درجہ بہتر ہے۔ عزت و آبرو کی روٹی کو قرآن "رزق کریم" کہتا ہے اور اسے سچے مومنوں کی خصوصیت قرار دیتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْۤا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِیْمٌ ۝ (۸/۷۴)

اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اور جن لوگوں نے (ان مہاجرین کو) پناہ دی اور ان کی مدد کی یہی لوگ ہیں جو سچے مومن ہیں۔ ان کے لئے حفاظت کا سامان اور عزت کی روٹی ہے۔

اس کے مقابلہ میں قرآن دوسرے گروہ کا ذکر کرتا ہے (جس کی تفصیل آگے چل کر آئے گی)، جو دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ لَهٗ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ (۲۲/۹) "اس کے لئے دنیا میں

رسوائی ہے " ذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۷/۱۵۲) " ان کے لئے دُنیاوی زندگی میں ذلّت ہے۔" وہ دنیا میں سخت عذاب کے دن گزارتے ہیں۔ عَذَابًا اَلِيْمًا فِي الدُّنْيَا (۹/۷۴) " ان کے لئے دنیا میں المناک سزا ہے۔" یہ سزا، بھوک اور خوف کا عذاب ہے۔ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ (۱۶/۱۱۲) " اللہ نے انہیں بھوک اور خوف کے عذاب کا مزہ چکھایا۔" یعنی اس دنیا میں سامانِ زیست کا میسر نہ آنا، یا میسر آنا تو اس ذلت وخواری سے میسر آنا جس میں ہر وقت بالادست قوتوں کا خوف سر پر سوار رہے، قرآن کی رُو سے خدا کا عذاب ہے۔ اس کے برعکس خوشگوار زندگی، جسے خدا کا انعام کہا گیا ہے، وہ ہے جس میں ذلت و خواری نہ ہو۔ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ (۱۰/۲۶) " نہ ان کے لئے روسیاہی ہوگی نہ ذلت وخواری۔" وہ جنتِ آدم کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (۲۰/۱۱۸—۱۱۹) اس میں نہ بھوک ہے، نہ برہنگی۔ نہ پیاس ہے نہ دھوپ۔ یعنی خوراک، لباس، مکان سب کچھ میسر ہے۔ اور عزت کے ساتھ میسر۔

عزت کی روٹی کیسے ملتی ہے؟

یہ حقیقت ہمارے سامنے آ گئی کہ قرآن کریم کی رو سے

دُنیا میں عزت کی زندگی، جس میں سامانِ زیست کی فراوانی ہو، اور جس کے لئے کسی بالادست قوت کا خوف دامنگیر نہ ہو، انسانیت کے شایانِ شان زندگی ہے۔ بھوک اور خوف کی زندگی، خدا کا عذاب ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ دنیا میں سامانِ زیست اور قوت و ثروت، جس سے دوسروں کا خوف باقی نہیں رہتا، حاصل کس طرح ہوتی ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ کائنات، طبیعیات کے قانون (physical Laws) کے مطابق چل رہی ہے اس لئے طبیعی زندگی کے سامانِ زیست کے حصول کے لئے طبیعیات کے قانون کا اتباع کرنا ہوگا۔ اس میدان میں ہر انسان برابر ہے۔ مومن اور کافر کی کوئی تمیز نہیں۔ جب دونوں کی طبیعی زندگی ایک ہی قانون کے تابع ہے تو اسبابِ زندگی کے حصول کے لئے قوانین بھی ایک ہی ہوں گے۔ جس طرح ایک غیر مسلم سانس لے کر زندہ رہتا ہے، اسی طرح ایک مسلمان کے لئے بھی ہوا وجہ زیست ہے۔ جس طرح وہ غذا کا محتاج ہے اسی طرح یہ بھی ہے۔ سنکھیا کا اثر دونوں پر یکساں ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ جب ایک یہودیہ نے رسول اللہ کے کھانے میں زہر ملایا تھا تو اس زہر کا اثر حضورؐ کے جسم اطہر پر بھی اسی طرح ہوا جس طرح کسی دوسرے انسان کے جسم پر ہوتا ہے۔ لہذا متاعِ حیات اور سامانِ زندگی کے حصول کے لئے ہر انسان کے لئے

یکساں قانون ہیں اس میں مومن و کافر کی کوئی تمیز نہیں۔ جب خدا نے کہا ہے کہ وَ سَخَّرَ لَکُمْ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے ہم نے اسے تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے) تو اس کا مخاطب انسان ہے۔ صرف مسلمان نہیں۔ جو انسان تسخیر فطرت کے لئے جدّ و جہد کرے گا، فطرت اپنے چھپے ہوئے خزانے اس کے حوالے کر دے گی۔ اس میں مسلم و غیر مسلم کی تمیز نہیں ہوگی۔ خدا نے آدمی کو "خلیفہ فی الارض"[1] کہا ہے اور آدمی ہی کو علم الاسماء (علم اشیائے فطرت) دیا ہے۔ لہذا جو انسان اس علم سے فائدہ

---

[1] قرآن نے آدم کو خلیفہ فی الارض کہا ہے۔ لیکن ہم نے اسے "خلیفۃ اللہ فی الارض" سمجھ لیا (یعنی زمین میں خدا کا نائب)۔ جب اس سے یہ دشواری پیش آئی کہ کیا فرعون و نمرود بھی خلیفۃ اللہ ہو سکتے ہیں تو پھر اس "خلافتِ الٰہیہ" کو مومنین کے لئے مخصوص کر دیا۔ حالانکہ قرآن نے آدم کو کہیں خلیفۃ اللہ فی الارض نہیں کہا۔ خلیفہ کے معنی کسی کے پیچھے آنے والا (SUCCESSOR) "جانشین" کے ہیں۔ زمین میں آدمی سے پہلے جو نوع آباد تھی، آدمی اس نوع کا جانشین ہے۔ یعنی اس کی جگہ اب یہ آباد ہے۔ یہ ہے مفہوم خلیفہ فی الارض کا۔ یعنی زمین میں انواعِ سابقہ کا جانشین۔ نہ کہ اللہ کا نائب۔ (باقی صفحہ ۳۱)

اٹھانا چاہے اٹھالے۔ اس باب میں فطرت نہ کسی سے بخل کرے گی نہ کسی کی رعایت۔ اس کے لئے اس ضمن میں مسلم و غیر مسلم، مومن و کافر، سب برابر ہیں۔ مومن و کافر کا فرق متاعِ فطرت کے استعمال میں جا کر ہوگا جس کی تفصیل ذرا آگے چل کر ملے گی۔ تسخیرِ فطرت کی جد و جہد کے نتائج میں کچھ فرق نہیں ہوگا۔ دیکھئے قرآن کس قدر وضاحت سے کہتا ہے کہ

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝ (۱۱/۱۵)

جو دنیا کی زندگی اور زینت چاہتا ہے ہم ان کی جد و جہد کا پورا پورا

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۰) اسی آدم (نوعِ انسانی) کو اللہ نے علمِ اسماء فطرت دیا تھا جو اس سے پہلی آبادی کو حاصل نہیں تھا۔ وہ نوع، سلسلۂ ارتقا میں اس سے پیچھے تھی۔ لہٰذا دنیا میں سابقہ آبادیوں کے جانشین ہونے اور تسخیرِ فطرت کے علم کے وارث ہونے میں مومن و کافر کی کوئی تمیز نہیں۔ مومن اور کافر کی تمیز آگے چل کر آتی ہے جہاں ماحصلِ تسخیرِ فطرت کے استعمال کا سوال آتا ہے۔

خدا کی نیابت کا تصور اسلئے بھی غلط ہے کہ نیابت اسکی ہوتی ہے جو خود موجود نہ ہو۔ اللہ ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے۔ اس لئے اس کی نیابت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مومن کا فریضہ قوانینِ خداوندی کو دنیا میں نافذ کرنا ہے (تفصیل کیلئے دیکھئے میری کتاب "ابلیس و آدم" عنوان "آدم")

ماحصل اسی دنیا میں دیدیتے ہیں۔ اس میں ان کے لئے کوئی کمی نہیں رہجاتی۔ اس سلسلہ میں سورۂ بنی اسرائیل کی آیات (۲۱-۱۸) بھی دیکھئے جن سے یہ حقیقت بالکل واضح ہوجاتی ہے۔ تنقیحات بالا سے حسب ذیل نتائج ہمارے سامنے آگئے۔

(۱) دنیاوی زندگی میں سامان زیست کی فراوانی اور بے خوفی ہی شایان شان انسانیت ہے۔

(۲) سامان زیست تسخیر فطرت سے ملتا ہے۔

(۳) فطرت کے ذخائر ہر اس شخص اور قوم کے ہاتھ آسکتے ہیں جو ان کے لئے جد و جہد کرے۔ اس میں مومن اور کافر کی کوئی تمیز نہیں۔

(۴) جو قوم تسخیر فطرت میں جد و جہد نہ کرے وہ متاع حیات سے محروم رہ جاتی ہے۔

(۵) اور متاع حیات سے محرومی، یا اس کے لئے دوسروں کی محتاجی لعنت اور ذلت کی زندگی اور خدا کا عذاب ہے۔

دنیا اور آخرت کا مفہوم اب آگے بڑھئے۔ قرآن کریم میں ایسی آیات بھی ملتی ہیں جن میں "دنیاوی متاع" کو حقیر و قلیل کہا گیا ہے اور اس کے مقابلے میں "آخرت" کو کثیر و پائیدار۔ یہی وہ آیات ہیں جن سے "مذہب پرست" طبقہ نے سہارا پکڑا اور "دنیا

ناثبات" کی تمام "متاعِ حقیر و ذلیل" کو کفار کا حصّہ بتا دیا۔ اور آخرت خدا کے پیاروں کے لئے مخصوص کر لی۔ لہٰذا قرآن کے ان مقامات کا صحیح طور پر سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ یہ مقام ذرا مشکل ہے۔ اس لئے مشکل ہے کہ اس میں ایک ایسی بات سامنے آئے گی جو شاید اکثر قارئین کے لئے بالکل نئی ہو۔ لہٰذا یہ مقام ذرا گہرے غور و فکر کا محتاج ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن، انسان کی پیدائش سے لے کر اس کی طبعی موت تک کے عرصہ کو دنیا کی زندگی قرار دیتا ہے۔ اور موت کے بعد کی زندگی کو حیاتِ اخروی سے تعبیر کرتا ہے۔ حیاتِ اخروی (یعنی موت کے بعد کی زندگی) پر ایمان، مسلمان ہونے کے لئے لاینفک ہے۔ جو اس سے انکار کرتا ہے وہ مومن نہیں ہو سکتا، خواہ وہ دوسری تمام باتوں پر ایمان رکھے۔

لیکن

(اور یہ لیکن بہت اہم ہے) دنیا اور آخرت کے الفاظ سے قرآن کا فقط یہی مفہوم نہیں۔ وہ ان الفاظ کو اور معنوں میں بھی استعمال کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن بہت سے الفاظ کو بطور اصطلاحات استعمال کرتا ہے۔ اور جب تک ان قرآنی اصطلاحات کا صحیح مفہوم نہ سمجھ لیا جائے قرآن کا صحیح، صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا۔ قرآن فہمی کی راہ میں ایک

ایسا اہم نکتہ ہے جسے نظر انداز کر دینے سے وہ تمام الجھاؤ پیدا ہو گئے جو آج ہمارے لئے اس درجہ وجہ پریشانیٔ قلب و نظر بن رہے ہیں اور جن کی وجہ سے ہزار کوشش کے باوجود، ہم قرآن کے صحیح مفہوم تک نہیں پہنچ پاتے۔ بلکہ بعض اوقات قرآنی مفہوم میں اس قسم کی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں جن سے باہر نکلنا مشکل ہو جاتا ہے) اور انسان قرآنی آیات کو (معاذ اللہ) متضاد سمجھنے لگتا ہے۔ لہذا قرآن فہمی کی صحیح صورت یہ ہے کہ قرآن کی ان اصطلاحات کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ ان اصطلاحاتِ قرآنیہ میں "دنیا" اور "آخرت" کی اصطلاحات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان اصطلاحات تک پہنچنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر سن لیجئے کہ اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ حیات بعد الممات کا عقیدہ صحیح نہیں۔ حیات بعد الممات تو ایک ایسی حقیقت ہے جس پر ہمارے ایمان کی بنیاد ہے۔ زندگی ایک جوئے رواں ہے جو یہاں سے وہاں تک مسلسل چلی جاتی ہے۔ اس میں انقطاع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہذا قرآن میں جہاں آخرت سے مراد حیات بعد الممات ہے، وہاں اس سے حیات بعد الممات ہی مراد ہے۔ جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ قرآن نے دنیا اور آخرت کے الفاظ کو صرف اسی مفہوم کے لئے استعمال نہیں کیا بلکہ اصطلاحی طور پر ان الفاظ کو اور معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ اور اس وقت ہمارے سامنے ان ہی اصطلاحی معانی کی وضاحت ہے

"دنیا" کے لفظی معنی ہیں "قریبی" اور "آخرت" کے معنی ہیں بعد میں آنے والا۔ اسی کو بالفاظ دیگر مستقبل (Future) کہا جاتا ہے ایک فرد یا ایک قوم کی زندگی میں ایک مستقبل اسی دنیا میں آتا ہے لیکن (قرآنی نقطۂ نگاہ سے) اس مستقبل کے علاوہ، دوسرا مستقبل، اس زندگی کے بعد کی زندگی میں بھی آتا ہے۔ لہذا، مستقبل دو طرح کا ہے۔ اس زندگی میں۔ اور اس کے بعد کی زندگی میں۔ ہم پہلے اس زندگی کے مستقبل کے متعلق گفتگو کریں گے اور بعد میں مرنے کے بعد کی زندگی کے مستقبل کے متعلق۔

پہلے اس زندگی کے مستقبل کو لیجیے۔ دنیا میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو ہمیشہ پیش پا افتادہ، قریبی مفاد Immediate gain) کے پیچھے لپکتے ہیں۔ ان کی تمام تگ و تاز مفاد عاجلہ کے لئے ہوتی ہے۔ اِن کے سامنے صرف اپنا آپ ہوتا ہے۔ انہیں اس کی فکر نہیں ہوتی کہ بعد میں آنے والوں کا کیا حشر ہوگا۔ وہ فقط اپنے عیش و آرام کو سوچتے ہیں، انہیں اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ آنے والی انسانیت (Humanity) پر کیا گذرے گی۔ ان کی ساری جد و جہد "حال" کے لئے ہوتی ہے۔ "مستقبل" کی انہیں کچھ فکر نہیں ہوتی۔ قرآن ان پیش پا افتادہ، قریبی مفاد عاجلہ کو "دنیا" سے تعبیر

کرتا ہے اور مستقبل کا نام "آخرت" رکھتا ہے۔ لہذا ان اصطلاحی معانی کی رُو سے، اس کے نزدیک "متاعِ دنیا" سے مفہوم ہے وہ مفاد جو انسان صرف اپنی ذات کے لئے تلاش کرتا ہے اور "سامانِ آخرت" سے مقصود ہر وہ متاع جسے آنے والی نسلوں کے لئے جمع کرتا ہے (قرآن کی رُو سے نسل سے مراد کسی انسان یا خاندان کی اپنی نسل نہیں بلکہ آنے والی پوری انسانیت ہے)۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ جو شخص (یا قوم) مفادِ عاجلہ (یعنی صرف اپنے حال کی خوشگواری) کے لئے کوشش کرتا ہے اس کا حال تو خوشگوار ہو جاتا ہے لیکن اس کا مستقبل روشن نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس انسانیت کی صحیح زندگی یہ ہے کہ انسانی کوششیں صرف حال کی خوشگواری ہی میں صرف نہ ہو جائیں بلکہ آنے والی انسانیت (یعنی مستقبل) کی خوشگواری کیلئے بھی جدوجہد کی جائے۔ وہ کہتا ہے کہ پیش پا افتادہ مفاد اپنے اندر بڑی کشش و جاذبیت رکھتے ہیں۔ ان کی درخشندگی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر دیتی ہے۔ اس سے عیش و آرام کی زندگی ملتی ہے۔ اس میں محنت کم کرنی پڑتی ہے اور نتائج فوراً سامنے آجاتے ہیں۔ لیکن اس نظریہ کے ماتحت زندگی بسر کرنے والی اقوام کا مستقبل تیرہ و تار ہو جاتا ہے۔ لہذا اس قوم کا "آخرت" میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اس باب میں دشواری یہ ہے۔ اور یہ چیز سطح بیں نگاہوں کو بہت جلد اپنے فریب میں لے آتی ہے۔

اس لیئے کہ حال کے پیش پا افتادہ مفاد بالکل ابھرے ہوئے سامنے ہوتے ہیں، لیکن مستقبل کے مفاد نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ لہذا مستقبل کے مفاد کے لیئے وہی کوشش کرے گا جسے اِس کوشش کے اَن دیکھے نتائج پر پورا پورا یقین ہو۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ دو کسان ہیں۔ اُن کے پاس ایک ایک من گیہوں ہے۔ یہی ان کی متاع ہے۔ ان میں سے ایک جاتا ہے اور زمین میں ہل جوت کر اپنی اس متاعِ حیات کو "مٹی میں ملا آتا ہے"۔ دوسرا اس پر ہنستا ہے اور اپنا گیہوں چکی میں پسوا کر گھر لے آتا ہے۔ اول الذکر کو مکئی اور باجرہ کی روٹیوں پر گزارہ کرنا پڑتا ہے اور بعض اوقات فاقے بھی کاٹنے پڑتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرے کسان کے بچے مزے سے گیہوں کی روٹی کھاتے ہیں۔ اس کسان کو قریبی خوش حالی نصیب ہو گئی۔ لیکن مستقبل میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ مستقبل اس دوسرے کسان ہی کا روشن ہو گا جس کے گھر ایک ایک دانہ، سات سات سو دانوں کے خوشے اور کھلیان بن کر آئے گا۔ بیج کے فصل بننے تک کا عرصہ تو اسے محنت اور مشقت سے گزارنا ہو گا، لیکن اس کے بعد ایک ایسا دائرہ (CYCLIC ORDER) قائم ہو جائے گا جس سے اس کا حال بھی خوشگوار ہو گا اور مستقبل بھی روشن۔ لیکن اس کے لئے شرط اولیں اس حقیقت پر یقین ہے کہ میں نے جو دانہ مٹی میں ملا دیا ہے

وہ ضائع نہیں جائے گا۔ کائنات میں ایک اٹل قانون جاری و ساری ہے جو اس دانہ کو کونپل میں تبدیل کرے گا۔ کونپل ڈنٹھل بنے گی، ڈنٹھل میں خوشہ آئے گا اور خوشہ جھولیاں بھر بھر کر اناج دیدے گا۔ اسے اپنی محنت اور کائنات کے اس اٹل قانون کے نتائج پر یقین محکم ہونا چاہیئے۔ اگر اس پر یقین نہیں تو یہ کبھی اپنے دانے مٹی میں نہیں ملائے گا۔ یہ بھی انہیں، دوسرے کسان کی طرح پسوا کر گھر لے آئے گا۔ کائنات کا یہ قانون، جو دانہ کو خوشہ میں تبدیل کرتا ہے، سنۃ اللہ (قانون خداوندی) کہلاتا ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی (لا تبدیل لسنۃ اللہ) اس کا اٹل اور غیر متبدل ہونا ہی اس پر ایمان کا ضامن ہوتا ہے۔ اگر کسان کو اس کا یقین نہ ہو کہ دانہ ضرور خوشہ بن جائے گا تو وہ اپنے دانوں کو مٹی میں ملانے کا خطرہ (RISK) کبھی مول نہیں لے گا۔ چونکہ کسان کو قرنہا قرن کے تجربےؐ نے بتا دیا ہے کہ فطرت کے اس قانون میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی کہ جب دانے کو ایک خاص قاعدے کے مطابق مٹی میں ملا دیا جائے تو وہ خوشہ میں تبدیل ہو کر رہتا ہے

ؐ انسانوں کا تجربہ جو نسلاً بعد نسلٍ متوارث آگے چلا آتا ہے، تاریخ کہلاتا ہے۔ قرآن تاریخ کو اسی لئے بڑی اہمیت دیتا ہے اس کے لئے اس نے ذکر کی اصطلاح اختیار کی ہے (تفصیل کسی دوسرے مقام پر ملے گی)۔

اس لئے وہ اس یقین محکم کے ماتحت بیج کو مٹی میں ملا کر نہایت اطمینان سے انتظار کرتا ہے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ کسان کو اس امر کا یقین ہوتا ہے کہ اگر دانے کو ایک خاص قاعدے کے مطابق مٹی میں ملا دیا جائے اور پھر خاص قاعدے کے مطابق اس کی دیکھ بھال کی جائے تو وہ فصل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہاں سے دوسری شرط سامنے آگئی یعنی دانہ کو ایک خاص قاعدے اور اصول کے مطابق مٹی میں ملایا جائے اور اس کے بعد وقت پر پانی دیا جائے۔ اس پروگرام میں دیکھئے۔ بیک وقت دو کوششیں مصروف کار نظر آئیں گی۔ ایک فطرت کا غیر متبدل قانون اور دوسرے خاص قاعدے کے مطابق کسان کی محنت۔ اگر ان دونوں میں ہم آہنگی ہو گی تو خوشگوار نتیجہ برآمد ہو کر رہے گا۔ (اسے قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں) اگر کسان کی کوششیں قانونِ فطرت سے ہم آہنگ نہیں ہوں گی تو اس کی محنت ضائع جائے گی (اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ)۔ واضح رہے کہ قوانین الہٰیہ صرف قوانین فطرت کا نام نہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی قوانین الٰہیہ ہیں جن کی نگہداشت انسان کے لئے نہایت ضروری ہے۔ یہ قوانین قرآن کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ ان تمام قوانین کی پوری پوری نگہداشت کا نام تقویٰ ہے۔ لیکن قوانین فطرت ان قوانین کی

تقویٰ کا مفہوم

فہرست سے خارج نہیں۔ وہ بھی قوانین خداوندی کے اندر شامل ہیں۔ لہذا، ان قوانین کی نگہداشت بھی متقی بننے کے لئے ضروری ہے۔ آیئے ایک بار پھر سمجھ لیجئے کہ جس طرح وہ قوم جو صرف قوانین فطرت کی نگہداشت کرتی ہے متقی نہیں کہلا سکتی، اسی طرح وہ قوم بھی متقی نہیں کہلا سکتی جو قوانینِ فطرت کی نگہداشت نہیں کرتی۔ البتہ جو قوم قوانینِ فطرت کی نگہداشت کرتی ہے، اُسے اس کے نتائج حاصل ہو جائیں گے، خواہ وہ باقی قوانین کی اطاعت کرے یا نہ کرے۔ اور جو قوم قوانین فطرت کی نگہداشت نہیں کرے گی وہ ان کے نتائج سے محروم رہ جائے گی۔

کشمکش حق و باطل

اب ایک قدم اور آگے بڑھیئے۔ قرآن کہتا ہے کہ کائنات میں حق اور باطل کی کشمکش جاری رہتی ہے۔ حق کہتے ہیں کسی اسکیم کے مثبت پہلو (POSITIVE ASPECT.) کو جب وہ ٹھوس نتیجہ کی شکل میں سامنے آجائے۔ اور باطل اسکے برعکس منفیانہ پہلو (NEGATIVE ASPECT) ہوتا ہے جو تخریب پیدا کرتا ہے۔ قانون فطرت یہ ہے کہ ہر شے کے تخریبی پہلو سے ایک تعمیری پہلو برآمد ہوتا ہے۔ دانے کا خاک میں مل کر پھٹ جانا[۱]، اس اسکیم کا تخریبی پہلو ہے لیکن اس

۱؎ فالق الحب والنوی (۶ : ۹۵) "دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا" یہ صفتِ خداوندی اِس حقیقت پر شاہد ہے۔

تخریب (DESTRUCTION) سے تعمیر (CONSTRUCTION) کونپل کی شکل میں نمودار ہو جاتی ہے اور یہ سلسلہ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ کائنات کے ذرہ ذرہ میں یہ قانون کش مکش حق و باطل (تخریب و تعمیر) سرگرم عمل ہے قرآن کہتا ہے کہ اس کش مکش میں غلبہ ہمیشہ حق کا ہوتا ہے۔ یعنی ہر پروگرام میں آخرالامر، تعمیری پہلو، تخریبی پہلو پر غالب آتا ہے اور اس طرح ہر شے اپنے ارتقائی مدارج طے کرتی ہوئی اس مقام تک پہنچ جاتی ہے جو اس کے ارتقا کی آخری منزل ہے۔ تمام کائنات اسی طرح اپنے تخلیقی مدارج طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اس ضمن میں "تخلیق ارض و سماء بالحق" سے یہی مفہوم ہے۔ یعنی کائناتی نظام کا ماحصل تعمیر ہے، تخریب نہیں۔ یہ قانون خداوندی آفاقی کائنات (OUTER UNIVERSE) میں، اشیائے کائنات کے اختیار و ارادہ کے بغیر جاری و ساری ہے۔

۱؎ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱/۱۸)۔ ہم حق (کی تعمیری قوتوں) سے باطل (کی تخریبی قوتوں) پر نشانہ لگائے رہتے ہیں۔ اس طرح حق کی تعمیری قوتیں باطل کی تخریبی قوتوں کا سر کچل دیتی ہیں اور اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ تخریبی قوتیں ختم ہو جاتی ہیں (اور تعمیری قوتیں ٹھوس نتیجہ کی شکل میں باقی رہ جاتی ہیں)۔

یعنی کائنات کی ہر شے قانون فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے کُلٌّ لَهٗ قَانِتُوْنَ۔ لیکن انسان کو اختیار وارادہ بھی دیا گیا ہے۔ اس لئے انسان اپنی دنیا میں اس قانون کو اپنے اختیار وارادہ سے نافذ کرے گا۔ یہاں کسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو بیج کے دانوں کو قانونِ قدرت کی ہم آہنگی میں سپرد خاک کر دے۔ اور چاہے تو انہیں چکی میں پسوا کر روٹی پکا لے۔ اگر انسان اپنی محنت کو کائناتی قوانین کا ہم آہنگ بنا دے گا تو اس کی محنت اسی طرح ثمر بار ہوگی جس طرح آفاقی دنیا میں خدا کا قانون بار آور ہوتا ہے۔ وہاں بھی تعمیری پہلو (حق) کا تخریبی پہلو (باطل) پر غلبہ ہوتا ہے اور یہاں بھی ایسا ہی ہوگا۔ لہذا جو چاہتا ہے کہ آخر الامر، تعمیری پہلو غالب رہے اور اس طرح اس کا مستقبل روشن ہو جائے اسے چاہیئے کہ وہ قانون خداوندی کے نتائج پر یقین رکھتے ہوئے اپنی کوششوں کو اس قانون سے ہم آہنگ کر دے۔ ایسے انسانوں کا حال بھی درخشندہ ہوگا۔ اور مستقبل بھی روشن۔

یہ ہے "آخرت" (مستقبل) کا وہ مفہوم جس کا تعلق اس دنیا سے ہے۔ اب ہم اس کے دوسرے مفہوم کی طرف آتے ہیں۔

آخرت کا دوسرا مفہوم | ایک نظریۂ زندگی یہ ہے کہ انسان کی

زندگی صرف اس دنیا کی زندگی ہے۔ موت سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ انسانی زندگی سے مقصود اسی دنیا کا مال و متاع اکٹھا کرنا اور عیش و آرام کی زندگی بسر کرنا ہے۔ اس کے لئے جو تدبیر مناسب سمجھی جائے اختیار کیجا سکتی ہے۔ بس اتنا دیکھنے کی ضرورت ہے کہ وہ بات' حکومت کے قانون کے خلاف نہ ہو' اور اگر اس کے خلاف ہو تو ایسی کوشش کی جائے کہ انسان پولیس یا عدالت کی گرفت میں نہ آئے۔ حکومت کے قانون کے علاوہ نہ کوئی قانون ہے۔ اور پولیس اور عدالت کی گرفت سے آگے نہ کسی کی گرفت۔ اپنی کامیابی کے لئے جو حربہ استعمال کر لیا جائے' وہ جائز ہے۔

دوسرا نظریۂ زندگی یہ ہے کہ انسان کی طبیعی زندگی حیوانی سطح کی زندگی ہے۔ انسانی زندگی اس سے اوپر شروع ہوتی ہے۔ انسان صرف اس کے طبیعی جسم سے عبارت نہیں۔ اس میں ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) کہا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کا مقصد' انسان کے جسم کی پرورش اور اس کی ذات کی نشوونما' دونوں ہیں۔ جس طرح جسمانی پرورش کے لئے قانون مقرر ہیں اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لئے بھی قوانین ہیں۔ یہ قوانین وحی کے ذریعے ملتے ہیں اور قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ انہیں مستقل اقدار کہتے ہیں۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ دنیاوی ساز و متاع حاصل کرنے کے لئے پوری پوری کوشش

کرے۔ لیکن جب کبھی ایسا ہو کہ دنیاوی فائدہ اور مستقل قدر میں ٹکراؤ ہو، تو دنیاوی فائدہ کو مستقل قدر پر قربان کر دے۔ اس سے انسانی ذات کی نشو ونما ہوتی جائے گی، اور اس طرح انسان، اس زندگی کے بعد، اگلی زندگی میں، مزید ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے، آگے بڑھتا جائے گا۔ اسے "حیات آخرت" کہا جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کاروبار کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اگر میں اس میں ذرا سا دھوکا دے جاؤں تو مجھے نہایت آسانی سے ہزاروں روپے کا فائدہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ دھوکا اس انداز سے دیا جا سکتا ہو کہ کسی کو علم تک نہیں ہو سکتا۔ اور اگر علم ہو بھی جائے تو تھوڑی سی رشوت دے کر معاملہ صاف کرا لیا جا سکتا ہے۔ اگر اس کا ایمان "حیات آخرت" پر نہیں تو وہ بلا تامل یہ کارروائی کر گزرے گا۔ لیکن اگر وہ حیات آخرت پر ایمان رکھتا ہے تو وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا، کیونکہ دیانتداری ایک مستقل قدر ہے۔ اور مستقل قدر کی حفاظت سے انسانی ذات کی نشو ونما ہوتی، اور اس کی آخرت کی زندگی سنورتی ہے۔ اس کے برعکس، بددیانتی سے اُسے دنیاوی مفاد تو حاصل ہو سکتے ہیں لیکن اس سے اس کی ذات تباہ ہو جاتی ہے۔ پھر اس کا یہ بھی ایمان ہے کہ بددیانتی، پولیس یا عدالت کی گرفت میں آئے یا نہ آئے، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ خدا کا قانونِ مکافات ایسا ہے کہ انسان کا کوئی عمل ــــ حتیٰ کہ دل میں گزرنے والا

خیال تک بھی، اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتا۔ اس کا ہر عمل نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے۔ اور انہی اعمال کے مطابق اس کی حیاتِ اُخروی مرتب ہوتی ہے۔

مقصودِ زندگی

"دنیا اور آخرت" کے ان معانی کو سامنے رکھیے اور پھر ان مقامات پر غور کیجئے جن میں قرآن نے صرف دنیا (حال کے پیش پا افتادہ مفاد) کو خزف ریزے اور آخرت (مستقبل) کے مفاد کو متاعِ حقیقی قرار دیا ہے، ساری بات واضح ہو جائے گی۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ ہر فرد یا ہر قوم صرف اپنی اپنی ذات کو سامنے نہ رکھے۔ ایسا کرنے سے انسان صرف اپنے ذاتی مفاد ہی کو مقصودِ زندگی سمجھ لیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ مقصودِ زندگی، نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود ہے کیونکہ اس سے انسانیت اپنے ارتقائی مدارج طے کرتی اپنے منتہیٰ کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ وہ خود غرض انسانوں (یا اقوام) کو پیش پا افتادہ مفاد پر جھپٹ پڑنے والے قرار دیتا ہے اور اس مفاد کو متاعِ دنیوی (قریبی مفاد) سے تعبیر کرتا ہے۔ ان کے برعکس وہ انسان ہیں جو دنیا میں ایسا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں پوری کی پوری انسانیت پروان چڑھے۔ وہ اسے مستقبل کی خوشحالی (آخرت) سے تعبیر کرتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ قرآن کے نزدیک محض قریبی مفاد (دنیا) کے حصول کی جدوجہد کبھی

مستحسن قرار نہیں پاسکتی۔ اس کے نزدیک حقیقی سعی وطلب انسانیت کی خوشگواری کے لئے ہونی چاہیئے۔ یعنی پوری کی پوری نوع انسانی کی خوش حالی۔ اپنی اور آنے والی نسلوں کی مرفہ الحالی۔ پوری کی پوری ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کی ترقی۔ اس کے ساتھ ہی قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ جو افراد اس طرح مفادِ خویش کے بجائے انسانیت کے مفادِ کلی کو سامنے رکھتے ہیں۔ اور اس مفاد کے حصول کے لئے کسی مستقل قدر کو نہیں توڑتے۔ تمام اقدار کی پوری پوری پابندی کرتے ہیں، تو اس سے ان کی ذات کی اس طرح نشوونما ہوتی جاتی ہے کہ وہ حیاتِ جاوید کے اہل ہوجاتے ہیں۔ یوں، ان کی دنیا (موجودہ زندگی) کی شادمانیوں کے ساتھ حیاتِ آخروی (مرنے کے بعد کی زندگی) بھی طیب اور خوشگوار بن جاتی ہے۔

جن دو گروہوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، قرآن، ان کی زندگی اور اس کے مآل کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے تاکہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے۔ وہ کہتا ہے کہ جو لوگ محض پیش پا افتادہ مفاد (حال کی بہبود) کی فکر کرتے ہیں، انہیں اپنی کوششوں کے نتائج فوراً مل جاتے ہیں۔ لیکن ان کا مستقبل میں، کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

دو گروہ | فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا

فِی الدُّنۡیَا وَمَا لَهٗ فِی الۡاٰخِرَةِ مِنۡ خَلَاقٍ (۲/۲۰۰)

جو لوگ اس نظریہ کے قائل ہیں کہ انہیں قریبی مفاد ہی مل جانے چاہئیں۔ (انہیں وہ مفاد مل جاتے ہیں) لیکن ان کا استقبل (کی خوش حالیوں) میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان کا حال اور مستقبل دونوں روشن ہوں انہیں اس کے مطابق حصے مل جاتے ہیں۔

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّقُوۡلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَةً وَّفِی الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ نَصِیۡبٌ مِّمَّا كَسَبُوۡا ؕ وَاللّٰهُ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ۝ (۲/۲۰۱)

اور جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ خدا کا نشوونما دینے والا قانون ایسا کردے کہ ان کا حال بھی مستحسن ہو جائے اور مستقبل بھی، اور اس طرح وہ (بدحالیوں اور نامرادیوں کے) انسانیت سوز عذاب سے بچ جائیں، تو انہیں ان کی کوششوں کے نتائج اسی طرح سے مل جائیں گے۔ اس لئے کہ اللہ (کا قانونِ مکافات نتائج برآمد کرنے میں دیر نہیں لگاتا (جس وقت نتائج پختگی حاصل کر لیتے ہیں ٹھیک اسی وقت ان کا ظہور ہو جاتا ہے)۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ جو قوم مستقبل کی خوشگواریوں اور

مرفہ الحالیوں کے لئے جدو جہد کرے، اس کا حال تاریک ہو، اس لئے کہ مستقبل کی خوش حالی کے لئے ابتدائی جدو جہد کے بعد ایک ایسا دائرہ قائم ہو جاتا ہے جس میں حال اور مستقبل کے کنارے ملتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ کسان والی مثال میں، جب وہ ابتدائی مشکلات پر قابو پا کر فصل تیار کر لیتا ہے تو فصل کے گھر آنے کے ساتھ ہی اس کا حال خوشگوار ہو جاتا ہے اور اس کے بعد وہ پھر اگلی فصل کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اس جدو جہد کا ماحصل پھر مستقبل کی مرفہ الحالیوں کی صورت میں سامنے آجاتا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح آگے بڑھتا رہتا ہے۔ یعنی حال اور مستقبل دونوں روشن اور تابناک۔ اسی لئے فرمایا کہ

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ (۱۶/۳۰)

جو لوگ حسن عمل کرتے ہیں، ان کی یہ دُنیا (حال کی زندگی) حسینؑ بن جاتی ہے۔

ؑ قرآن نے اعمالِ صالحہ کو اعمالِ حسنہ کہہ کر پکارا ہے۔ حسن کیا ہے؟ توازن وتناسب (PROPORTION) قائم رکھنے کا نام۔ اس سے الگ، حسن کی اور کوئی تعریف نہیں ہو سکتی۔ اس لئے، جس طرح اعمالِ صالحہ کے معنی ایسے کام ہیں جو زندگی کی ناہمواریوں کو ہمواریوں میں بدل دیں (باقی صفحہ ۴۹ پر)۔

اور حال کے ساتھ ان کا مستقبل بھی روشن ہو جاتا ہے۔

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۗ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (۱۰/۶۳-۶۴)

جو لوگ (زندگی کے اس صحیح نظریہ پر جو قرآن نے پیش کیا ہے) یقین رکھتے ہیں۔ ان کے لئے حال کی زندگی اور مستقبل دونوں میں خوشگواریاں ہیں۔ یہ خدا کا ایسا محکم قانون ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور یہ بہت بڑی کامیابی و کامرانی ہے۔

یہاں تک ہم نے دو گروہ دیکھ لئے۔ ایک وہ جو صرف اپنے حال کو خوشگوار دیکھنا چاہتا ہے اور دوسرا وہ جو مستقبل کی درخشندگی پر نگاہ رکھتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اوّل الذکر گروہ کا حال (PRESENT) خوشگوار

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۸) اور انسانیت کے بگڑے ہوئے کام سنوار دیں۔ اسی طرح اعمالِ حسنہ کے معنی وہ اعمال ہیں جو انسان کی متضاد قوتوں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں توازن و تناسب قائم رکھ سکیں اور حسنِ کائنات میں اضافہ کرتے جائیں۔ یہی کامیابیوں اور شادکامیوں کی اصل و بنیاد ہیں۔ قرآن کریم جو پروگرام دیتا ہے اس کے مطابق انسان کے تمام اعمال، صالحہ اور حسین قرار پاتے ہیں۔

ہو جاتا ہے۔ لیکن مستقبل (FUTURE) میں اس کے لیے کوئی حصّہ نہیں ہوتا، اور موخرالذکر کا حال اور مستقبل دونوں خوشگوار ہو جاتے ہیں۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ (۳/۱۴۵)

جو صرف حال کی خوشگواریاں چاہتا ہے اسے یہ کچھ مل جاتا ہے
جو مستقبل کی تابناکی کے لئے خواہاں ہوتا ہے اسے وہ کچھ مل جاتا ہے۔

خدا کا قانون یہ نہیں کہ جو لوگ صرف حال کی خوشگواریاں چاہیں وہ انکی محنت کو بے کار کر دے۔ نہیں۔ ان کی محنت کبھی رائگاں نہیں جاتی۔ جو صرف پیش پا افتادہ مفاد چاہتے ہیں انہیں یہ مفاد مل جاتے ہیں۔ اور جو مستقبل پر بھی نگاہ رکھتے ہیں ان کی کوششیں اسی نہج سے بارآور ہوتی رہتی ہیں۔ دیکھئے سورہ بنی اسرائیل میں اس حقیقت کبریٰ کو کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا (۱۷/۱۸)

جو شخص (یا قوم) پیش پا افتادہ (فوری) فائدہ چاہتا ہے، تو

ہم اپنے قانون کے مطابق، اسے مفادِ عاجلہ (فوری فائدہ) دیدیتے ہیں۔ لیکن مستقبل میں اس کے لئے ایسی زندگی ہوگی جس میں ساری صلاحیتیں جھلس جائیں گی اور اس کا نشو و نما رُک جائے گا۔ اور اس زندگی میں وہ اپنے آپ کو بدحال اور ٹھکرایا ہوا پائے گا۔

یہ ایک گروہ ہوا۔ اور دوسرا گروہ۔

وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا۝ (۱۷/۱۹)

لیکن جو انسان (یا قوم) مستقبل کا طالب ہو۔ اور اس کیلئے جیسی کوشش کرنی چاہیئے ویسی کوشش کرے۔ اور وہ خدا کی مقرر کردہ مستقل اقدار پر ایمان رکھے تو ان کی یہ کوششیں پورا پورا پھل لائیں گی۔

یہ فطرت کا قانون ہے، نہ اوّل الذکر گروہ کی کوششیں ضائع جاتی ہیں اور نہ ثانی الذکر کی۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا۝ (۱۷/۲۰)

ہماری نشو و نما دینے والی سہولتیں (عَطَآءِ رَبِّكَ) دونوں گروہوں

ؔ قرآن میں ربوبیت اس قانون کا نام ہے جو نشو و نما دیتا ہے۔ عطاء ربانی

(باقی صفحہ ۵۲ پر)

کو آگے بڑھاتی چلی جاتی ہیں - تیرے رب کے قانون نشو و نما کی
بخشش عام کسی پر بند نہیں ہوتی -

اِن کوششوں میں ہر قوم اپنی اپنی جدو جہد کے مطابق آگے بڑھتی جاتی ہے اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۱۷/۲۱) تاریخی نظائر پر غور کرو اور دیکھو کہ ہمارا یہ قانون' معاشی کارگاہ میں کس طرح مختلف قوموں کو ایک دوسرے سے بڑھاتا چلا جاتا ہے - لیکن آخر الامر ہوتا یہ ہے کہ شرف حال کی خوشگواریاں چاہنے والے مٹ جاتے ہیں اور مستقبل کی مرفۃ الحالیوں کے طالب بلند مدارج حاصل کر لیتے ہیں وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَكْبَرُ تَفْضِيْلًا (۱۷/۲۱) "مستقبل کے درجات اور معاشی خوشحالیاں سب سے بڑھ کر ہیں" اور مستقبل صرف اسی کے لئے ہوتا ہے جو معاشی زندگی کو

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۱) وہ سہولتیں ہیں جو نشو و نما کے لئے عام ملتی ہیں - ہوا، دھوپ، بارش، زمین - سب کے لئے بلا مزد و معاوضہ عام ہیں - یہ نہیں کہ حال کی خوشگواریاں چاہنے والوں پر یہ عمومی بخششیں بند ہو جائیں اور مستقبل چاہنے والوں پر ان کے دروازے کھل جائیں - خدا کا قانونِ طبیعی مومن و کافر دونوں کے لئے یکساں ہے دونوں کو اس قانون کے مطابق نتائج ملتے چلے جاتے ہیں - فرق صرف مستقبل (آخرت) کی زندگی میں پڑتا ہے۔ لہ قرآن میں فضل کا لفظ بالعموم معاشی خوشحالیوں کیلئے استعمال ہوا ہے -

وحی کے ابدی قوانین (مستقل اقدار) کے تابع رکھے۔ لیکن جو قوم دنیا کے لئے کوئی الگ خدا تجویز کرلے (یعنی قریبی مفاد کے لئے اور قوانین وضع کرے) اور آخرت کے لئے اور قوانین سامنے رکھے، تو یہ وہ شرک ہے جس کا نتیجہ بدحالی اور درماندگی کے سوا اور کچھ نہیں۔

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا (۱۷/۲۲)

اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود (سرچشمۂ قانون) نہ ٹھہراؤ۔ ورنہ ایسے ہو رہو گے کہ ہر طرف سے نفرین کے مستحق اور ہر طرف سے درماندگی میں پڑے ہوئے۔

اس سے ایک تیسرا گروہ سامنے آگیا۔

تیسرا گروہ گروہ اوّل ـــــ وہ لوگ جو اپنے حال کی زندگی ہی کو زندگی سمجھتے ہیں۔ مستقبل پر نگاہ نہیں رکھتے۔ انہوں نے اپنے حال کی زندگی کی کامیابیوں کے لئے تدابیر وضع کر رکھی ہیں اور وہ ان تدابیر پر عمل کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان سے انہیں پیش پا افتادہ مفاد حاصل ہوتے جاتے ہیں۔ اس گروہ کو کفار کا گروہ کہئے یعنی جو مستقبل (آخرت) سے منکر ہے۔

گروہ ثانی ـــــ وہ گروہ ہے جو حال اور مستقبل (دنیا اور

آخرت) دونوں کو سامنے رکھتا ہے۔ اس کے لئے اس کے پاس ایک ضابطۂ حیات ہے جو حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) میں کوئی حدِ فاصل قائم نہیں کرتا۔ ان کا حال اور مستقبل دونوں روشن اور تابناک ہوتے ہیں (فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً) اس گروہ کو قرآن مومنین کی جماعت کہتا ہے۔ ان کے پیشِ نظر تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت ہوتی ہے جسے وہ قرآن کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اور تیسرا گروہ وہ ہے جو حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) کو دو الگ الگ دنیائیں قرار دیتا ہے۔

وہ سمجھتا ہے کہ کچھ کوششیں ایسی ہیں جو صرف دنیا کی کامیابی عطا کرتی ہیں اور کچھ ایسی جو "عاقبت" سنوارتی ہیں۔ اس کے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ جس کی عاقبت سنور رہی ہو اس کی دنیاوی زندگی بھی کامیاب ہو۔ بلکہ، اس کے، برعکس وہ یہ سمجھتا ہے کہ آخرت اسی کی کامیاب ہوتی ہے جس کی دنیاوی زندگی نامراد و ناکام ہو۔ یعنی وہ انسان کی دنیاوی زندگی اور آخرت کی زندگی کو دو الگ الگ زندگیاں سمجھتا ہے جن کا ایک دوسرے کے ساتھ کچھ تعلق نہیں۔ یعنی اس کے نزدیک دنیاوی زندگی کی خوش حالیوں اور ناداریوں کے لئے کسی اور

خدا کا قانون کارفرما ہے اور اخروی کامیابیوں اور شادکامیوں کے لئے کسی اور کا۔ وہ ان دونوں کے لئے قانون کا سرچشمہ ایک نہیں سمجھتا۔ وہ ہر دو دوائر میں الگ الگ "خداؤں" کا قانون رائج سمجھتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس قسم کا انسان، جو دو کشتیوں میں پاؤں رکھ کر سفر کرتا ہے، ڈوب کر رہے گا۔ جو شخص درخت کی جڑ میں آگ لگائے اور پتوں پر پانی چھڑکے، اس کی کوششوں کا نتیجہ ظاہر ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ انسانی جسم کے ایک حصے کا خون صالح ہو سکتا ہے اور دوسرے حصے کا فاسد۔ اس کا ایمان ہے کہ پودے کی اولین کونپل مرجھا کر خشک ہوتی ہے تو ہونے دیجئے۔ اس کی کچھ پرواہ نہیں۔ آخر الامر خوشے دانوں سے بھرے ہوئے ملیں گے۔ اس لئے کہ اس کے نزدیک کونپل کے لئے الگ قانون ہے اور ڈنٹھل اور خوشوں کے لئے الگ قانون۔ قرآن کہتا ہے کہ جو شخص (یا قوم) حیاتِ کائنات سے متعلقہ قانونی وحدت (UNITY OF LAW) کو اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے، اسے کہہ دیجئے کہ اس کا حال بھی بدحال ہوگا اور مستقبل بھی تاریک۔ غور کیجئے قرآن اس باب میں کس قدر ابھرے ہوئے الفاظ میں حقیقت کو واشگاف کرتا ہے، جب وہ کہتا ہے۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (۲/۸۵)

کیا تم قانون کائنات کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو؟

جو ایسا کرتا ہے

فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵)

جو تم میں سے ایسا کرے اس کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا کہ اس کے لئے دنیاوی زندگی میں بھی ذلت و رسوائی ہوگی اور قیامت کے دن وہ سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

وہ اس ہیچ زندگی کا نام "کفر" بعد الاسلام" (۹/۷۴) قرار دیتا ہے اور . . . . اُن کے حال اور مستقبل دونوں کو تاریک بتاتا ہے۔ عَذَابًا اَلِيْمًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (۹/۷۴) اور واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ دنیاوی زندگی میں اُن کا کوئی پرسانِ حال اور مددگار نہیں ہوتا۔ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۹/۷۴)۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ قرآن کی رُو سے
• ایک گروہ وہ ہے جس کی حال کی زندگی، کامیابی اور کامرانی کی زندگی ہوتی
ہے، لیکن اس کا مستقبل تاریک ہوتا ہے۔
ایک گروہ وہ ہے جس کا حال اور مستقبل دونوں روشن ہوتے ہیں۔
تیسرا گروہ وہ ہے جس کا حال اور مستقبل دونوں تاریک ہوتے ہیں۔
اس کے نزدیک ایسا گروہ کوئی نہیں ہوسکتا جس کا حال تو تاریک ہو لیکن
مستقبل روشن۔ وہ کہتا ہے کہ جس کا حال تاریک ہے اس کا مستقبل بہرحال
تاریک ہوتا ہے مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖ أَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ
أَعْمٰى۔ جو یہاں اندھا ہے وہ وہاں بھی اندھا ہوگا۔ یہ ہو نہیں سکتا
کہ کسی کی دنیاوی زندگی ذلت و خواری میں گزرے اور عاقبت سنور رہی
ہو۔ جو ایسا کہتا ہے وہ حال اور مستقبل کی نشو و نما کے لئے الگ الگ
خداؤں کا قانون ماننا چاہتا ہے۔ یہ شرک ہے۔ توحید نہیں۔ ایک خدا
پر ایمان نہیں۔ جماعت مومنین کی اس دنیا کی زندگی عزت اور قوت
غلبہ و حکومت۔ سرفرازی و سربلندی کی زندگی ہوتی ہے۔ اگر انکی
یہ زندگی ایسی نہیں تو ان کی آخرت کی زندگی بھی خوشگواریوں کی زندگی
نہیں ہوسکتی۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ کسی قوم کو اس دنیا میں دولت
اور حکومت حاصل ہو لیکن اس کی آخرت کی زندگی تباہ و برباد ہو۔

لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی قوم کی دنیاوی زندگی ذلت و خواری کی زندگی ہو اور اس کی عاقبت درخشندہ و تابناک ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج جگرسوز و خود افروز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ کسی قوم کا کسی وقت، محض ہنگامی طور پر، نیچے گر جانا اور بات ہے، اور اس کا اس زوال اور انحطاط پر یہ کہہ کر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا اور بات، کہ، کوئی بات نہیں۔ اگر ہمیں دنیا میں عزت و حکومت حاصل نہیں، تو نہ سہی۔ آخرت میں جنت کے حقدار تو ہمیں ہوں گے۔ یہ ان کی بھول ہے۔

زندگی کے ٹکڑے

قرآن آیا تو اس نے دیکھا کہ ساری دنیا نے، حیاتِ انسانی کو، طول اور عرض دونوں سمتوں میں، بری طرح ٹکڑے ٹکڑے کر رکھا ہے۔ طول میں یوں کہ اس نے دنیا اور آخرت کو الگ الگ دنیائیں تصور کر رکھا ہے۔ دنیا ارباب حکومت کے سپرد ہے جو حال کو کامیاب بنانے کے مدعی ہیں۔ آخرت ارباب مذہب کے

قبضہ میں ہے جو لوگوں کی عاقبت سنوارنے کے دعویدار ہیں۔ عرض کی سمت دیکھا تو ہر فرد اپنے آپ کو الگ حیات کا پیکر سمجھتا ہے اور اگر زندگی کی بعض ضروریات کے تقاضے بعض انسانوں کو ایک جگہ جمع بھی کر دیتے ہیں (انہیں شعوب و قبائل و اقوام کہا جاتا ہے) تو وہ اپنے اپنے مفاد کی فکر کرتے ہیں عالمگیر انسانیت کا مفاد ان کے پیش نظر نہیں ہوتا۔ یہ تھی ساری دنیا کی حالت نزول قرآن کے وقت۔ وہ حالت جسے اس نے "فَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے اور شرک کہہ کر پکارا ہے۔

قرآن نے کہا کہ حیات کی اس طرح تقسیم نفسِ واقعہ (FACTS) کے خلاف ہے۔ حیات انسانی ایک ناقابل تقسیم وحدت (INDIVISIBLE UNIT) ہے۔ وہ نہ طول کی طرف بٹ سکتی ہے نہ عرض کی سمت۔ طول کی سمت یہ ایک جوئے رواں ہے جو اس دنیا سے آگے بڑھتی ہوئی آخرت تک مسلسل چلی جاتی ہے۔ مسلسل و متواتر، غیر منقسم و غیر منقطع۔ زمان (TIME) کی صراط مستقیم پر مختلف نشانات صرف گزرگاہوں کے نشانات ہیں۔ اور بس۔ اس لئے دنیا اور آخرت کی تمیز نفس واقعہ کے خلاف ہے۔ لہذا جب حقیقت حال یہ ہے تو یہ روش یکسر باطل ہے کہ حال کے متعلق ارباب حکومت کے قوانین نافذ العمل ہوں

اور مستقبل کے متعلق، پیشوایانِ مذہب کے آئین و دساتیر۔ دوسری جانب عرض کی سمت آیئے تو مختلف افراد ایک "نفسِ حیات" کے مظاہر ہیں۔ اسی طرح جیسے قمقمے، پنکھے، شینیں، سب بجلی کی ایک لہر (ELECTRIC CURRENT) کے حرکیاتی مظاہر ہوتے ہیں۔ اس لئے افراد، شعوب، قبائل و اقوام کی تقسیم بھی غیر فطری ہے۔ تمام انسان ایک خاندان کے افراد، ایک درخت کے پتے اور ایک سمندر کے قطرے ہیں جن کی اصل و بنیاد (BASE) ایک ہے

دین کیا ہے؟

یہ تھی وہ عظیم القدر حقیقت (یعنی وحدتِ خالق سے وحدتِ خلق۔ اور وحدتِ حیات اور وحدتِ قانون کا تصور) جسے قرآن نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس نے اس حقیقت کو بطور ایک نظریہ ہی کے پیش نہیں کیا بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ انسانی نظامِ تمدن و معاشرت میں اس وحدتِ حیات کا عملی مظاہرہ کس طرح ہوگا۔ یہ عملی طریق جس سے یہ عظیم المرتبت حقیقت ایک زندہ پیکر کی صورت میں سامنے آجاتی ہے، دین کہلاتا ہے۔ لہٰذا دین نام تھا اس طریقِ عمل کا جس سے ایک طرف حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) ایک غیر منقسم وحدت بن جاتے تھے اور دوسری طرف تمام افرادِ نوعِ انسانی ایک عالمگیر برادری کے ایسے اجزاء، جیسے سمندر کے قطرات۔ دین کے ارکان و مناسک اسی غیر مرئی

حقیقت کو محسوس و مشہود شکل میں سامنے لانے کے ذرائع و اسباب تھے۔ یعنی اس پروگرام کے مختلف اجزا تھے جن سے اس نظامِ زندگی کو عملاً متشکل ہونا تھا جسے اس نے الدین کہہ کر پکارا ہے۔ دین کے اس نظام کی خصوصیت یہ تھی (یا یوں کہئے کہ اس کا فطری نتیجہ یہ تھا) کہ تمام اقتدار انسانوں کے ہاتھ سے چھن کر اس قانون کے ہاتھ میں آگیا جو اپنی اصل کے اعتبار سے انسانوں کا خودساختہ نہ تھا بلکہ وہاں سے ملا تھا جو ہدایت کا سرچشمہ ہے اور جسے خدا کہا جاتا ہے۔ اس نظام میں اطاعت فقط قانون خداوندی کی تھی۔ اور قانون کی اطاعت بھی غلام کی سی بالجبر اطاعت نہیں، بلکہ اسطرح کہ انسان، ان قوانین پر پورے غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پہ پہنچے کہ وہ واقعی اس کی دنیاوی اور اخروی زندگی کو خوشگوار اور تابناک بنانے کا ذریعہ ہیں۔ اور اس طرح، دل اور دماغ کی پوری رضامندی کے بعد؛ ان پر عمل کرنا شروع کر دے۔ "اطاعت" کے معنی ہی ایسی پابندی کے ہے جسے انسان، بطیب خاطر اپنے اوپر عائد کرے۔ اس طرح دین کے نظام میں اقتدار کسی کے ہاتھ میں نہ رہا۔ اور جب اقتدار کسی کے ہاتھ میں نہ رہا تو زندگی کی ناہمواریاں بھی ناپید ہوگئیں۔ اس نظام کے حلقہ میں بسنے والی تمام جماعت کی زندگی کا نصب العین، تھا انسانیت کے مستقبل کی درخشندگی۔ تمام

نوعِ انسانی کی ربوبیت (پرورش)۔ اس کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ ان کا حال خود بخود روشن ہو گیا۔ اس لئے کہ، جیسا کہ، ہم اوپر دیکھ چکے ہیں یہ فطرت کا اٹل قانون ہے کہ جس کا مستقبل روشن ہو اس کا حال ضرور تابناک ہوتا ہے۔ دیکھئے قرآن نے کیسی وضاحت سے اس قانون کو بیان کیا ہے۔

إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ (۴۰/۵۱)

ہم اپنے رسولوں اور جماعتِ مومنین کی حال کی زندگی کو بھی کامیاب بناتے ہیں اور مستقبل کی زندگی کو بھی جب نتائج خود کھڑے ہو کر پکار اٹھیں گے۔

یہ نہیں کہ یہ نصرت یونہی اتفاقیہ عمل میں آجاتی ہے بلکہ فرمایا کہ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ (۳۰/۴۷) "ہم پر مومنین کی نصرت فرض ہے"۔ غور کیجئے۔ قانون خداوندی کی ہمہ گیری اور محکمیت کس قدر واضح انداز سے بیان کی گئی ہے۔ دوسری جگہ اس جماعت کو مخاطب کر کے فرمایا کہ نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ (۴۱/۳۱) "دنیا کی زندگی اور آخرت دونوں میں ہم تمہارے پشت و پناہ ہیں"۔ قرآن نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ اس نظام میں، جو مستقبل کی خوش حالی کا

ضامن ہو، ابتداءً محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے اور نتائج نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس مفاد عاجلہ والے تھوڑی سی کوشش سے محسوس نتائج سامنے لے آتے ہیں۔ لیکن گھبراؤ نہیں مفاد عاجلہ والے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔ تم پر کبھی غالب نہیں آسکیں گے وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (۴/۱۴۱) ایسا نہیں ہوسکتا کہ خدا کا قانون، مستقبل پر ایمان رکھنے والے مومنین پہ ان لوگوں کو غلبہ دیدے جو (صرف مفاد عاجلہ کو سامنے رکھتے ہیں) یہ لوگ اپنے سامنے مفاد عاجلہ کے ڈھیر دیکھ کر یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ زندگی کی دوڑ میں آگے نکل گئے اور جنہوں نے مستقبل کو سامنے رکھا وہ پچھڑ گئے۔ ان کا یہ گمان غلط ہے۔ بیج بونے والا کسان کبھی اس کے مقابلہ میں ناکام نہیں رہ سکتا جس نے اپنے بیج کے دانوں کو پسوا کر روٹی پکالی۔ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ (۸/۵۹) مفاد عاجلہ والے یہ گمان نہ کرلیں کہ یہ آگے نکل گئے۔ بالکل نہیں، یہ کبھی دوسرے گروہ پر بالادست نہیں ہوسکتے۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ - انجام کار غلبہ انہیں کا رہے گا جو قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں۔ کفار (مفاد عاجلہ والوں) کا

مومنین پر غلبہ پانا تو ایک طرف، یہ ان کے برابر بھی نہیں ہو سکتے۔ اَفَمَنْ کَانَ مُؤْمِنًا کَمَنْ کَانَ فَاسِقًا ط لَا یَسْتَوٗنَ (۳۲/۱۸) کیا مومن اور فاسق دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ یہ کبھی نہیں ہو سکتا یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔" پھر اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ حال کی زندگی میں تو "کفار اور فاسقین" بڑھے ہوئے ہوں گے، اور مومنین کا غلبہ صرف حیاتِ اُخروی میں ہوگا۔ اُن کا حال درخشندہ ہوگا اور ان کا مستقبل۔ قرآن نے اسے بالکل واضح کر دیا کہ یہ غلبہ و تسلط اسی دنیا میں ہوگا۔ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ کَالْفُجَّارِ (۳۸/۲۸) کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم اس دنیا میں (فی الارض) اُن کو جو ایمان لائے اور اُنہوں نے صلاحیت بخش کام کئے، اُن کے برابر کر دیں گے جنہوں نے فساد برپا کرنے والے کام کئے؛ کیا ہم حال اور مستقبل میں ہم آہنگی پیدا کرنے والوں کو اُن کے برابر کر دیں گے جو ان دونوں میں تفریق کرتے ہیں" (فجار)۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان بالآخرت کا فطری نتیجہ عاقبت بینی اور مآل اندیشی ہے۔ لہذا جو قوم عاقبت اندیش ہو اسکا مقابلہ وہ لوگ کس طرح کر سکتے ہیں جو دُور کی بات سوچ ہی سکیں۔

جماعت مومنین

قرآن کے ان تمام دعاوی (یا قوانین خداوندی) کی زندہ شہادت وہ نتائج تھے جو ساری دنیا کے سامنے ہیں۔ کیا اُس جماعت سے بڑھ کر، جسے قرآن نے مومنین کہہ کر پکارا ہے، کسی اور جماعت کی آخرت بھی سنوری ہوئی ہو سکتی ہے؟ اور کیا اس جماعت سے بڑھ کر کسی اور جماعت کی دنیا بھی زیادہ کامیاب تھی؟ ان کی حکومت اسی زمین پر قائم ہو گئی تھی (لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ) ان کی جنت یہیں سے شروع ہو چکی تھی۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔ انہوں نے اپنی کوششوں کو خدائی قانون سے ہم آہنگ کر لیا تھا۔ (رَضُوْا عَنْهُ) اور خدائی قانون کی انقلاب آفریں قوتیں ان کی کوششوں سے ہم آہنگ ہو گئی تھیں۔ (رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ)۔ نتیجہ دنیا کے سامنے تھا۔

اسلام کی اس سب سے پہلی داعی جماعت نے جو کچھ کر کے دکھایا، وہ یونہی، ہنگامی واقعہ یا اتفاقی حادثہ نہیں تھا بلکہ قانونِ فطرت کا اٹل نتیجہ تھا۔ جس طرح سائنس کے اصول کے مطابق کسی معمل (LABORATORY) میں مختلف اجزا کے کیمیاوی تجزیہ اور امتزاج (CHEMICAL ANAlYSIS & SYNTHESIS) سے متعین نتائج سامنے آجاتے ہیں، اسی طرح انسانی حیاتِ اجتماعیہ میں قوانینِ خداوندی سے

ہم آہنگی و توافق سے بھی، اٹل نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ انہی اٹل نتائج کا نام استخلاف فی الارض تھا جس میں انسانی زندگی کو پورا پورا توازن نصیب ہو گیا[1] تھا اور اس لئے ان میں حسن ہی حسن جھلک رہا تھا۔ اس میں حیات، طول اور عرض دونوں میں اپنی وحدت قائم کئے ہوئے تھی۔ نہ آخرت دنیا سے الگ تھی نہ انسانیت کے ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اس جماعت نے تسخیر فطرت سے کائنات میں بکھری ہوئی قوتیں اپنے قبضہ میں کی ہوئی تھیں، اور ما حصل فطرت (متاع ارض) کو آسمانی قوانین (مستقل اقدار) کے مطابق تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس تحصیل و تقسیم کے نظام کا نام دین تھا۔ یعنی متاع ارضی (دنیاوی اسباب زیست) کے حصول کے لئے ہر فرد کی اپنی اپنی بساط کے مطابق پوری پوری جد و جہد اور کامل سعی و کاوش اور اس کے ماحصل، متاع ارضی کی تقسیم اس انداز سے ہو کہ ہر فرد کو اس کی امکانی قوتوں (POTENTIALITIES) کے نشو و نما پانے (FULLY DEVELOPED ہونے) کے لئے پورے پورے اور یکساں مواقع میسر ہوں۔ اس کا نام قرآنی نظام ربوبیت تھا۔ یعنی تمام افراد کی بنیادی ضروریات زندگی کا بہم پہنچانا اور ان کی مضمر صلاحیتوں کے نشو و نما کے سامان فراہم کرنا، تاکہ ان کی دنیا اور آخرت

---

[1] اس کی تفصیل کے لئے دیکھئے میری مستقل تصنیف "نظام ربوبیت"۔

دونوں کی زندگی روشن ہو جائے۔

یہ تھا دین، جس میں نہ ملوکیت کا استبداد تھا، نہ مذہبی پیشوائی کی سیادت۔ نہ طبقات کی تقسیم تھی، نہ بساطِ زندگی کی ناہمواریاں۔ نہ دنیا، آخرت سے الگ تھی۔ نہ حال مستقبل سے جدا۔

اس کے بعد؟ اب اس کے بعد تاریخ کا ایک ورق اور الٹئے اور ایک عجیب تماشہ دیکھئے۔ وہی قوم تھی اور ان کے ہاتھوں میں وہی قرآن۔ لیکن اب ایک طرف ملوکیت اپنے پورے جبروت و اقتدار کے ساتھ مسلط تھی اور دوسری طرف مذہبی پیشوائیت اپنے کامل تقدس اور طمطراق کے ساتھ مستولی۔ انسانیت طبقات میں بٹ چکی تھی اور زندگی کے قدم قدم پر وہ ناہمواریاں سدِّ راہ تھیں جو نظامِ سرمایہ داری کا فطری نتیجہ ہوتی ہیں۔

اس مقام پر فطرتاً یہ سوال پیدا ہوگا کہ اگر وہ نظام، انسانی زندگی کی برومندی کا ضامن اور اس کی نشو و نما کا کفیل تھا تو وہ مسلسل آگے کیوں نہ بڑھتا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کی جگہ پھر وہی غیر فطری نظام کہن کیوں مسلط ہو گیا؟

میں اس سوال کا جواب متعدد بار دے چکا ہوں، اس لئے اس وقت

(نفٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ آپ سردست صرف اتنا دیکھئے کہ دین کے جس نظام کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، وہ نظام انسانی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کا ضامن ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر آپ اس نظام کی کفایت کو تسلیم کرتے ہیں تو سردست اس بحث میں نہ جائیے کہ وہ مستقل طور پر قائم کیوں نہ رہا۔ دیکھئے صرف یہ کہ اسی نظام کو پھر سے قائم کر لیا جائے تو انسانیت جگمگا اٹھے گی یا نہیں؟ یوں بھی اس وقت میرے مخاطب وہ لوگ ہیں (یعنی مسلمان)، جنہیں یہ تسلیم ہے کہ اس نظام میں اس کی صلاحیت موجود ہے کہ وہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی تمام ناہمواریوں کو مٹا کر، کاروانِ زندگی کو پھر سے متوازن و ہموار راہوں پر لے چلے۔ لہٰذا ہمیں اس وقت اس بحث میں الجھنے کی بجائے (کہ یہ نظام آگے کیوں نہ چلا) صرف یہ دیکھنا ہوگا کہ ملتِ اسلامیہ (یعنی موجودہ مسلمان) جس ذلت کی زندگی بسر کر رہی ہے، اس ذلت کے اسباب کیا ہیں اور اس کی اصلاح کی صورتیں کیا۔

بہرحال یہ آپ نے دیکھ لیا کہ دین کے نظام میں بادشاہت (ملوکیت) کا کہیں نام تک نہ تھا اور مذہبی پیشوائیت کو کوئی جانتا نہ تھا۔ اب ہم

(فٹ نوٹ صفحہ ٦٧) اس کی تفصیل میرے ایک مبسوط مقالہ (اسلام آگے کیوں نہ چلا) میں ملے گی جو "سلیم کے نام خطوط" میں شائع ہو چکا ہے۔

تاریخ کے جس دور میں پہنچے ہیں وہاں ملوکیت بھی موجود تھی اور مذہبی پیشوائیت (PRIESTHOOD) بھی۔

حقیقت یہ ہے کہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت، لازم وملزوم ہیں۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ دین کی رو سے حیات کی وحدت غیر منقطع ہوتی ہے۔ اس لئے اس میں حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) میں کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ ایک ہی قانون ہے جو پوری کی پوری غیر منقسم حیات پر حاوی ہوتا ہے۔ ملوکیت[1] سے مراد یہ ہے کہ دنیاوی امور کے لئے قانون کا سرچشمہ الگ تصور کر لیا جائے۔ جب آپ حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) کا تصور رکھتے ہوں لیکن دنیاوی اصولوں کے لئے قانون کا سرچشمہ الگ تجویز کر لیں تو لامحالہ آپ کو آخرت کے لئے بھی ایک جداگانہ ضابطہ کی ضرورت

---

[1] قرآن کی رو سے ملوکیت صرف یہی نہیں کہ باپ کے بعد بیٹا وارث تخت وتاج ہو جاتا ہے ملوکیت ہر اس نظام کا نام ہے جس میں دنیاوی امور کے لئے قانون کا سرچشمہ قرآن سے الگ ہو۔ خواہ اس کی شکل بادشاہت کی ہو یا جمہوریت کی۔ یہ الگ بات ہے کہ دین کے نظام میں، وراثتِ اقتدار کا تصور یکسر باطل ہوتا ہے کیونکہ جب کسی انسان کا اقتدار ہی نہیں ہو سکتا، تو اقتدار کی وراثت کیسی؟

پڑے گی۔ وہ ضابطہ جو صرف آخرت سے متعلق ہو اور دنیا کے ساتھ اسکا کچھ واسطہ نہ ہو مذہب[1] کہلاتا ہے۔ لہذا ملوکیت اور مذہب، وحدت حیات کے ٹوٹنے کے بعد، لازم و ملزوم طور پر وجود میں آجاتے ہیں۔ جس طرح پانی کے قطرہ کا تجزیہ کیا جائے تو ہائیڈروجن اور آکسیجن جداگانہ اور متمیز تشخص کے ساتھ وجود میں آجاتی ہیں۔

اس مقام پر اس حقیقت کو اچھی طرح سے سمجھ لیجئے کہ میں نے "مذہب" کا لفظ کن معنوں میں استعمال کیا ہے اور دین سے مفہوم کیا ہے۔ مذہب سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اس دنیا کی زندگی کو، آخرت کی زندگی سے الگ کر کے، اس زندگی کو ارباب سیاست کے سپرد کر دے اور آخرت کی زندگی کو

---

[1] میں "مذہب" اور "دین" کے الفاظ الگ الگ استعمال کر رہا ہوں۔ قرآن مذہب نہیں لایا تھا حتیٰ کہ "مذہب" کا لفظ بھی غیر قرآنی ہے۔ سارے قرآن میں یہ لفظ کہیں نہیں آیا۔ وہاں صرف دین کا ذکر ہے۔ وہ دین لایا تھا۔ مذہب اسوقت پیدا ہوا جب نظامِ دین مفقود ہو گیا۔ آج ہمارے پاس "مذہب" ہے، دین نہیں لہذا میری تحریروں میں جہاں "مذہب" کا لفظ آئے اس سے یہی مفہوم ہو گا۔ میں اسلام کو "دین" کہہ کر پکار رہا ہوں (کہ قرآن نے اسے دین کہا ہے) اسے "مذہب" نہیں کہتا کیونکہ مذہب سے مفہوم ہے (OTHER - WORLDLINESS)۔

ارباب شریعت کے حوالے کر دے۔ یعنی خدا کی دنیا الگ ہو اور قیصر کی الگ۔ بادشاہ (یا حکومت) اپنا ٹیکس وصول کرے اور مذہبی پیشوا اپنا خراج۔ حکومت کے قوانین کی خلاف ورزی جرم کہلائے اور شریعت کے احکام کی خلاف ورزی سے گناہ لازم آئے۔ جرم کی سزا اسی دنیا میں مل جائے، اور گناہ کی سزا اگلی دنیا میں جا کر ملے۔ اسی طرح دنیاوی حکمرانوں کی خوشنودی کے انعامات یہاں ملیں، اور خدا کی خوشنودی کی جزا جنت میں پہنچ کر۔ یہ ہے وہ تصور زندگی جسے "مذہب" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس، اسلام کا تصورِ حیات ہے جسے وہ دین کے نام سے پکارتا ہے۔ آئندہ صفحات میں جہاں جہاں مذہب اور دین کے الفاظ آئیں ان کے لئے یہ مفہوم سامنے رکھئے تاکہ کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو سکے۔

اب آگے بڑھیئے۔

مذہب اور سیاست

اگر مذہب اور سیاست۔ امور دنیا اور امور آخرت۔ ایک ہو جائیں، اور دونوں قوانین خداوندی کے تابع رہیں، تو دین متشکل ہو جاتا ہے۔ یعنی دین میں ملوکیت اور مذہب کا الگ الگ تشخص باقی نہیں رہتا۔ لہذا ملوکیت اپنے قیام کے لئے ضروری سمجھتی ہے کہ مذہب اپنی جگہ پر قائم رہے۔ اور مذہب اپنے قیام کے لئے ملوکیت کا قیام ضروری سمجھتا ہے۔ اس طرح

ان دونوں میں (بظاہر تضاد کے باوجود) باہمی سمجھوتہ ہو جاتا ہے۔ کھشتری (حکومت کرنے والی قوم) برہمن کی رکھشا (حفاظت) کرتا ہے۔ اور برہمن کھشتری کو اشیرباد (دعا) دیتا ہے۔ محراب و منبر سے بادشاہ کو ظل اللہ قرار دے کر اَیَّدَہُ اللہُ بِنَصْرِہٖ کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ اور تخت و تاج، مساجد و مکاتب کے لئے جاگیریں وقف کر کے مذہبی سیادت کی حفاظت کرتا ہے۔ مذہب اس کے معاوضہ میں ملوکیت کے استحکام و بقا کے لئے لوگوں کے دل میں یہ فریب پختہ طور پر جاگزیں کرتا رہتا ہے کہ دنیا قابلِ نفرت چیز ہے۔ سیاست و حکومت کے دھندے دنیاداروں کے ہیں۔ خدا کے نیک بندوں کو دنیاوی امور سے الگ رہنا چاہیئے۔ ان کا مقصود و منتہیٰ، آخرت کی نجات ہے۔ ان کا محبوب و مطلوب خدا کا دیدار ہے۔ جو شخص اس دنیا میں جتنا ذلیل ہوگا، اتنا ہی خدا کے ہاں مقرب و مقبول ہوگا۔ وقس علیٰ ھذا۔ اس فسوں سازی سے عوام کی توجہات، آخرت پر مرتکز ہو جاتی ہیں اور ملوکیت اپنی مفاد پرستیوں میں بے زمام ہو جاتی ہے۔ اب ملوکیت کے لئے کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا۔ مذہب کی طرف سے لوگوں کو "صبر"[1] (استبداد کے خلاف لب تک نہ ہلانے) کی ایسی تلقین کی جاتی ہے کہ وہ ہر جور و ستم کو خدا کی رحمت سمجھنے

---

[1] صبر کا قرآنی مفہوم اس سے الگ ہے۔

لگ جاتے ہیں۔ ان کے سامنے مقربانِ بارگاہ خداوندی کی ایسی تصویر کھینچی جاتی ہے کہ وہ مفلسی اور تباہ حالی کو "اللہ کے پیاروں" کی علامات قرار دینے لگ جاتے ہیں۔ یوں مذہب کی فسوں کاریوں سے 'ملوکیت کی جڑیں مضبوط ہوتی چلی جاتی ہیں۔

تاریخ کے قدیم ایام میں مذہب کو اپنی دسیسہ کاریوں اور ابلہ فریبیوں کے لئے زیادہ کاوش نہیں کرنی پڑتی تھی۔ جب دین کے ضوابط (جو حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے انسانوں کو ملتے تھے) محفوظ نہیں رہتے تھے تو ارباب مذہب کے لئے یہ آسان تھا کہ جو کچھ جی میں آئے اُسے شریعت خداوندی کہہ کر پیش کر دیں یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْہِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ (۲/۷۹) لیکن اسلام کے معاملہ میں صورت مختلف تھی۔ یہاں (دین) کا ضابطہ (قرآن) اپنی اصلی شکل میں موجود تھا۔ اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا تھا۔ اس لئے اب مذہب کو اپنی فسوں کاریوں کے لئے خاص طور پر کاوش کرنی پڑی۔ ان حالات میں کامیابی کی صورت یہی ہو سکتی تھی کہ دین کے ضابطہ (قرآن) کے الفاظ اور اس نظام کے ارکان کو تو علیٰ حالہٖ قائم رہنے دیا جائے لیکن ان کے مقصود و مفہوم کو بدل دیا جائے۔ چنانچہ اس کے لئے مذہب نے یہ عقیدہ عام کیا کہ کلام الٰہی (ضابطۂ دین) قرآن کریم کے الفاظ میں برکت ہے (معنوں میں نہیں۔ الفاظ میں)

انہیں صرف دہراتے رہنا چاہیئے (جس طرح ہندو مذہب میں منتروں کے الفاظ دہرائے جاتے ہیں)[1] اسے "تلاوتِ قرآن" کہتے ہیں۔ یعنی بغیر سمجھے الفاظ کو دہراتے رہنا۔ (حالانکہ تلاوت کے معنی ہی کسی کے پیچھے چلنا یعنی پیروی کرنا ہے) دیکھئے اس ایک تبدیلی سے مذہب اپنے مقصد میں کس قدر کامیاب ہوگیا۔ دین کا ضابطہ (قرآن) بھی مسلمانوں کے سامنے رہا اور انہیں قرآن سے الگ بھی کر دیا۔ مذہب نے "تلاوتِ قرآن" (یعنی بے سمجھے بوجھے الفاظ کو دہراتے رہنے) کے ثواب میں ایسے ایسے سبز باغ دکھائے کہ ساری قوم اس میں اُلجھ کر رہ گئی۔ حالانکہ اسی قرآن میں ایک گروہ کے متعلق یہ مذکور ہے کہ (یَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ) (۳/۱۶۷)

مذہب کے حربے

وہ زبان سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتا۔" بلا سمجھے الفاظ دہراتے رہنے سے بھی یہی ہوتا ہے کہ انسان زبان سے وہ الفاظ ادا کرتا رہتا ہے جن کا کوئی مفہوم اس کے دل میں نہیں ہوتا۔ اسی طرح قرآن میں ہے کہ حالتِ سُکر (نشہ) میں صلوٰۃ کے قریب نہ جاؤ کیونکہ تم اس وقت جو کچھ زبان سے

---

[1] الفاظ میں تاثیر کا تصور انسانی تاریخ کے عصرِ سحر (MAGIC AGE) کی یادگار ہے۔ منتر۔ تعویذ۔ گنڈے۔ ورد۔ وظیفے۔ قرآنی آیات کے "اعمال" سب اسی اصل کی شاخیں ہیں۔

کہتے ہو۔ اسے سمجھتے نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ صرف الفاظ دہراتے رہنے سے قرآن کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ خدا نے قدم قدم پر قرآن میں، غور و فکر کرنے کی تاکید ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر قرآن کو سمجھے بغیر پڑھ لیا جائے تو غور و فکر کس پہ ہوگا؟ قرآن کے الفاظ کو محفوظ اس لئے رکھا گیا تھا کہ ان کا مطلب سمجھا جائے، اور مطلب اس لئے سمجھا جائے کہ اس کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ جب عقیدہ یہ پیدا ہو جائے کہ قرآن کے سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے الفاظ دُہرا لینے سے "ثواب" ہو جاتا ہے تو پھر اس پر عمل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ذرا آگے بڑھے تو پھر تفاسیر کے ذریعے ان تمام قرآنی اصطلاحات کو جنہیں دین نے اپنے نظام کو سمجھانے کے لئے اختیار کیا تھا، نئے معنی پہنانے شروع کر دیئے جس سے ہر بات "آخرت" سے متعلق ہو جائے اور لوگوں کی نگاہوں میں "دنیا" ذلیل اور قابلِ نفرت شے بن جائے اعمال، جزا، سزا، حسنات، سیئات، فلاح، خسران، عزت، ذلت، سرخروئی، روسیاہی، سب کے سب "آخرت" پر اٹھا کر رکھ دیئے گئے۔

اب آئی "دین" کے ان ارکان کی باری، جو اس نے اپنے نظام کے قیام کے لئے تجویز کئے تھے۔ کلمہ، صلوٰۃ، صیام، زکوٰۃ، حج، یہ سب

ذرائع تھے نظامِ دین کے قیام و استحکام کے۔ مذہب نے انہیں رسوم بنا کر مقصود بالذات قرار دیدیا۔ یعنی یہ اعمال کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ ان کی رسمی ادائیگی ہی مقصود ہے اور بس۔

جن لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس طرح قرآن کے الفاظ دہرانے یا ارکانِ اسلام ادا کرنے سے حاصل کیا ہوتا ہے؟ ان کی تسکین کے لئے کہدیا کہ ان سے "ثوابؔ" حاصل ہوتا ہے اور یہ ملے گا آخرت میں جاکر۔ ثواب کا لفظ جس طرح مذہب میں استعمال ہوتا ہے ایسا مبہم ہے کہ

لہ "ثواب" کے قرآنی مفہوم کے لئے دیکھئے میرا مضمون "نجات" جو فردوس گمشتہ میں شامل ہے۔ اس وقت اتنا سمجھ لیجئے کہ قرآن نے جماعت مومنین کے لئے فرمایا کہ فَاٰتٰهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا (۳/۱۴۷) یعنی اللہ انہیں۔ دنیا میں ثواب" (یا دنیا کا ثواب) بھی عطا کرتا ہے۔ لہذا ثواب کوئی ایسے شے نہیں جس کا تعلق اس دُنیا سے نہ ہو یا وہ ایسی غیر محسوس شے ہو کہ انسان کو پتہ ہی نہ چلے کہ اسے ثواب ملا ہے یا نہیں۔ ثواب، قرآنی پروگرام پر عمل کرنے کا وہ نتیجہ ہے جو محسوس شکل میں اس دنیا میں بھی سامنے آجاتا ہے اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی۔ اس لئے جہاں تک اس دنیا میں ثواب کا تعلق ہے اس کا مفہوم متعین طور پر سامنے آجانا چاہیئے۔

اس کا کوئی متعین مفہوم کسی کے ذہن میں نہیں ہوتا۔ جہاں کوئی بات سمجھائی نہ جا سکے وہاں کہہ دیا جاتا ہے کہ اس سے "ثواب" ہوتا ہے۔ آپ کہنے والے سے کہیئے کہ صاحب "ثواب" عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کی جگہ اپنی زبان کا کوئی لفظ ارشاد فرما دیجئے تاکہ بات واضح ہو جائے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کے بعد وہ آگے چل ہی نہیں سکے گا۔ اس لئے کہ مذہب کا سارا نظام ابہام (VAGUENESS) پر قائم ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے ہاں ثواب کا تصور بھی مبہم ہے۔ اس سے کوئی ٹھوس حقیقت یا مشہود نتیجہ سامنے نہیں آتا۔

دین کی ساری عمارت۔ خدا کے صحیح تصور پر اٹھتی ہے۔ قرآن کریم نے خدا کا ایسا صحیح، بلند، منزّہ اور مکمل تصور دیا ہے جس سے انسانی زندگی کے سارے گوشے منور ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس دور میں جس کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے، خدا کے اس تصور کو بھی بدل دیا گیا ہے، اور اسکی جگہ انسانی ذہن کے خود ساختہ تصور نے لے لی۔ اس تصور کی رو سے یہ کہہ دیا گیا کہ خدا (معاذ اللہ) ایک مستبد حاکم کی طرح آسمانوں میں بیٹھا ہے اور چاہتا ہے کہ ہم اس کی "پرستش" کرتے رہیں۔ دین یہ کہنے کے لئے آیا تھا کہ قوانین الٰہیہ کے مطابق معاشرہ قائم کرو اور اپنی زندگی انہی قوانین کے تابع بسر کرو، اس کا نام تھا عبادت۔ "خدا کی عبادت"

کے معنی ہیں خدا کے احکام کی اطاعت ۔ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا ۔ زندگی کے قدم قدم پر یہ دیکھنا کہ اس باب میں خدا کا قانون کیا کہتا ہے ۔ اس سے انسان چوبیس گھنٹے "خدا کی عبادت" میں مصروف رہتا ہے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نے اپنے نظام کے قیام و استحکام کے سلسلہ میں روزوں جیسا ضبط خویش کا پروگرام اور صلوٰۃ اور حج جیسے اجتماعات مقرر کئے ہیں ۔ ان اجتماعات سے مقصود یہ ہے کہ افرادِ ملت قوانین خداوندی کو سامنے رکھ کر اپنی اجتماعی زندگی کے مسائل اور انسانیت کی نجات و سعادت کی راہوں کے متعلق غور و فکر کریں ۔ جب انسان ان قوانین خداوندی کی عظمت پر غور کرتا ہے تو ان کے احترام کے جذبہ سے اس کا سر خود بخود خدا کے حضور جھک جاتا ہے ۔ صلوٰۃ کے اجتماعات میں رکوع و سجود ' اسی احترام کے اظہار کی محسوس شکلیں ہیں ۔ اور یہ بھی عبادتِ خداوندی کا ایک جزو ہیں ۔ لیکن اگر ان اجتماعات میں یہ بنیادی مقصد باقی نہ رہے اور صرف چند رسوم کی ادائیگی کو مقصود سمجھ لیا جائے تو اس کا نام عبادت نہیں بلکہ "پرستش" ہوگا ۔ ہم نے پرستش کا لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے ۔

عوام ' ملوکیت کا استبداد اپنے سامنے دیکھتے تھے ۔ مذہب کو اندیشہ تھا کہ کہیں اس سے ان کے دل میں ملوکیت کی مخالفت کا احساس نہ ابھر آئے ۔

اس کی پیش بندی کے لئے اس نے یہ عقیدہ پیدا کر دیا کہ دنیا میں سب کچھ خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ کوئی انسان اپنے اختیار سے کچھ نہیں کرتا۔ ان بادشاہوں کی کیا مجال ہے کہ یہ اپنی مرضی سے کچھ کر سکیں۔ یہ ہمارے سامنے یونہی اکڑتے ہیں۔ اللہ کے سامنے ان کی کیا حقیقت ہے اس لئے ان کا کیا مقدور ہے کہ یہ اس کے حکم کے خلاف کچھ کر سکیں۔ لہذا جو کچھ ان کی طرف سے ہوتا ہے سب مشیتِ ایزدی سے ہوتا ہے۔ "خداشناس" کو یہ زیبا نہیں کہ وہ تیر کو دیکھے۔ اُسے ہر وقت نگاہ تیر انداز پر رکھنی چاہیئے۔ اس عقیدہ تقدیر نے ملوکیت کی گرفت کو فولادی بنا دیا۔ اب ان کی ہر شیطنت، خدا کی مشیت کا مظہر قرار پا گئی جس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔

ایک بنیادی تبدیلی

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، مذہب انفرادی چیز ہے اور دین اجتماعی نظام کا نام ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ مذہب میں ہر شخص اپنے اپنے طور پر مذہبی احکام اور رسوم پر عمل کرتا ہے لیکن دین میں انسان کی پوری زندگی ایک اجتماعی نظام کے تابع بسر ہوتی ہے۔ دورِ حاضر کی اصطلاح میں اسے "مملکت" کہتے ہیں یعنی دین پر عمل کرنے کے لئے ایک آزاد مملکت کی ضرورت ہے جس میں دین کے قوانین نافذ ہوں۔ اس قسم کی مملکت سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے

قائم فرمائی جس میں اجتماعی حیثیت سے قرآن کریم کے احکام اور قوانین نافذ ہوتے تھے۔ قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ اس میں، بجز چند احکام کے، باقی امور کے متعلق اصول دیئے گئے ہیں جن کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، جزئی احکام و قوانین، اسلامی مملکت مرتب کرتی ہے۔ یہ اصول ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہتے ہیں اور ان کی روشنی میں مرتب کردہ جزئی قوانین، زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں دین کا یہی نقشہ عملاً قائم تھا۔ حضورؐ کی وفات کے بعد بھی یہی نقشہ قائم رہا۔ اسے خلافت علیٰ منہاج نبوت کہا جاتا ہے۔ اس میں "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" اپنے اپنے طور پر نہیں ہوتی تھی بلکہ مرکزِ ملت (یعنی خلافتِ راشدہ) کی طرف سے جو احکام و ہدایات نافذ ہوتی تھیں، ان پر عمل کرنے کا نام "اطاعتِ خدا و رسول" تھا۔ اس تمام دوران میں، قرآن کریم کے علاوہ، مملکت کا کوئی اور ضابطہ نہیں تھا۔ نبی اکرمؐ نے قرآن کریم کو اس کی مکمل اور مرتب شکل میں امت کو دیا تھا اور اسی قرآن کی عام نشر و اشاعت، خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں ہوئی تھی۔ حضورؐ نے

احادیث

اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ اُمت کو نہیں دیا تھا۔ اتنا ہی نہیں۔ حضورؐ نے تاکید فرما دی تھی کہ کوئی شخص قرآن کے علاوہ، کوئی بات حضورؐ سے نہ لکھے۔ اگر کسی نے لکھی ہو تو اسے مٹا ڈالے۔

خلافت راشدہ میں بھی حضورؐ کی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں کیا گیا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں یہ سوال خاص طور پر زیر بحث آیا کہ حضورؐ کی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب کرنا چاہیئے۔ اس اہم سوال پر قریب ایک ماہ تک غور و خوض ہوتا رہا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا کہ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ پہلی امتوں نے جب خدا کی کتاب کے ساتھ اور چیزوں کو شامل کر دیا تو وہ تباہ ہو گئیں۔

جب خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی تو دین کا صحیح نقشہ بگڑ گیا۔ مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ سیاست سے متعلق امور حکومت نے اپنی تحویل میں رکھ لئے اور "مذہبی امور" کو آزاد چھوڑ دیا۔ مذہبی امور کا تعلق "خدا اور رسولؐ" سے تھا اس لئے اب خدا اور رسول کی اطاعت انفرادی طور پر ہونے لگی۔ اس کے لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ رسول اللہؐ کی احادیث جمع کی جائیں تاکہ ان کی رُو سے رسول کی اطاعت کی جائے۔ اس طرح جمع احادیث کا خیال پیدا ہوا اور انفرادی طور احادیث کے مجموعے مرتب ہونے شروع ہوئے۔ یہ کوششیں رسول اللہؐ کی وفات کے بہت عرصہ بعد شروع ہوئیں۔

روایات کے مجموعے

مثلاً ان مجموعوں میں سب سے زیادہ مستند مجموعہ امام بخاریؒ کا سمجھا جاتا ہے۔ وہ حضورؐ کی وفات سے

دو اڑھائی سو سال بعد مرتب ہوا تھا۔ (امام بخاریؒ کی وفات ۲۵۶ھ میں ہوئی تھی)۔ یہ مجموعے کسی سابقہ تحریری ریکارڈ سے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ زبانی روایات جمع کی گئی تھیں۔

جو ریکارڈ اس طرح مرتب ہو، خود اس کی حیثیت کس قدر مستند ہو سکتی ہے، ظاہر ہے۔ اس کے ساتھ جھوٹی روایات وضع کرنے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ اور یہ بہت آسان تھا۔ اگر کوئی شخص قرآن کریم میں ایک حرف کے اضافہ یا ردوبدل کرنے کی کوشش کرے تو بیک وقت لاکھوں آوازیں اس کی تردید میں اُٹھ کھڑی ہوں گی کیونکہ قرآن کریم کا نسخہ (جس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے) ہر جگہ موجود ہوگا۔ لیکن جن باتوں کا ریکارڈ ہی کہیں موجود نہ ہو، ان میں اپنی طرف سے اضافہ یا ردوبدل کر دینا مشکل کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ وضعی روایات بننی شروع ہوئیں۔

وضعی روایات

یہ کس کثرت سے بنیں اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایئے کہ امام بخاریؒ نے لکھا ہے کہ انہیں چھ لاکھ احادیث ملیں جن میں سے انہوں نے چھ ہزار کے قریب قابلِ قبول سمجھ کر رکھ لیں اور باقی پانچ لاکھ چورانوے ہزار کو مسترد کر دیا۔ (ان چھ ہزار سے اگر مکررات کو حذف کر دیا جائے تو ان احادیث کی تعداد تین چار ہزار سے زیادہ نہیں رہتی)۔ یہ ایک

جامع احادیث کا بیان ہے۔ اسی طرح مختلف مجموعے مرتب ہوئے۔ جو احادیث صحیح سمجھ کر ان مجموعوں میں داخل کر لی گئیں ان کے صحیح ہونے کی سند بھی نہ خدا نے دی تھی نہ رسول اللہؐ نے۔ جامعین احادیث نے جن روایات کو اپنی بصیرت یا معیار کے مطابق صحیح سمجھا، انہیں قبول کر لیا۔ باقیوں کو مسترد کر دیا۔

اگر ان روایات کے متعلق اتنا ہی سمجھا جاتا کہ یہ وہ اقوال یا اعمال ہیں جنہیں رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ان میں غلط بھی ہو سکتی ہیں اور صحیح بھی۔ اور غلط اور صحیح کا معیار یہ مقرر کیا جاتا کہ ان میں سے جو روایت قرآن کریم کے خلاف جاتی ہو، وہ صحیح نہیں ہو سکتی کیونکہ رسول اللہؐ کا کوئی ارشاد گرامی یا عمل مبارک، قرآن کے خلاف ہو نہیں سکتا، تو بھی خیر تھی۔ لیکن ان کے متعلق عقیدہ یہ قائم کیا گیا کہ

روایات کے متعلق عقیدہ

(i) یہ مثلہٗ معہٗ — قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل ہیں۔

(ii) یہ خدا کی وحی ہیں جنہیں جبریل امین اسی طرح لے کر نازل ہوتے تھے جس طرح قرآنی آیات کو۔

(iii) ان کی اطاعت، رسول اللہؐ کی اطاعت ہے۔

(۶ا) یہ مستقل دین ہیں۔

(۷) اگر قرآن کا کوئی حکم ان کے خلاف جائے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ کیونکہ حدیث، قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔

اس سے آپ اندازہ لگایئے کہ اس راستے سے کیا کیا خارجی چیزیں، دین میں داخل نہ ہو گئی ہوں گی اور انہوں نے کس کس طرح سے دین کو مذہب میں بدل نہیں دیا ہو گا؟ یہ کچھ نادانستہ بھی ہوا ہو گا اور دین کے دشمنوں نے ایسا کچھ دانستہ بھی کیا ہو گا۔ بہرحال، دانستہ ہوا ہو یا نادانستہ، نتیجہ یہ کہ یہ سب کچھ دین بن گیا اور انہی کی اطاعت کا نام رسول اللہؐ کی اطاعت قرار پا گیا۔ اس سے آگے بڑھے تو انہی کی رُو سے قرآن کریم کی تفسیر کر دی گئی۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ فلاں معاملہ میں قرآن یوں کہتا ہے اور روایت اس کے خلاف کہتی ہے، تو فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ تم قرآن کو زیادہ سمجھتے ہو یا رسول اللہؐ زیادہ سمجھتے تھے! یہ جواب ایسا ہے جس کے سامنے کسی کو مجالِ لب کشائی نہیں ہو سکتی، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جس تفسیر کو رسول اللہؐ کی تفسیر کہہ کر پیش کیا جاتا ہے، وہ صرف رسول اللہؐ کی طرف منسوب ہوتی ہے۔ اس کی کوئی سند نہیں ہوتی کہ وہ واقعی رسول اللہؐ کی ہے۔ اس کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ سارا قرآن اِن روایات کے تابع چلا گیا۔ اب مذہب کا مدار، روایات پر قرار پا گیا اور قرآن ثواب کی غرض سے تلاوت کے لئے باقی رہ گیا۔

یہی وہ مذہب ہے جو ہزار سال سے ہمارے ہاں مروج چلا آ رہا ہے۔

فقہ بعض بزرگوں نے اپنے اجتہاد سے کام لے کر، وقت کی ضرورتوں کے مطابق بعض مسائل کا فیصلہ کیا۔ انہیں فقہ کے احکام کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ احکام وقتی تھے اور جن تقاضوں کے ماتحت وہ مرتب کئے گئے تھے ان کے بدل جانے سے وہ احکام بھی بدل جانے چاہئیں تھے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ عقیدہ وضع کر لیا گیا کہ یہ تمام احکام بھی ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے اور آیندہ کسی کو حق نہیں ہوگا کہ وہ اس بارے میں اجتہاد کر سکے۔

تصوّف روایات اور فقہ میں پھر بھی کسی نہ کسی سند کی ضرورت پڑتی تھی۔ لیکن اس کے بعد ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس میں کسی حکم کے لئے کسی سند کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ تھا کشف والہام۔ ایک بزرگ کہہ دیتا کہ مجھے یہ بات کشف سے معلوم ہو گئی ہے۔ اور کشف سے مراد تھی براہ راست خدا سے ہمکلامی یا وہ "علم لدنی" جو بغیر ظاہری اسناد کے سینہ بسینہ منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ یعنی ختم نبوت کا عقیدہ بھی، اور خدا سے ہمکلامی کا دعویٰ بھی۔ رسول اللہؐ کے متعلق خدا کے اس حکم پر بھی ایمان کہ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ عَلَیْکَ (جو آپ پر وحی کیا جاتا ہے اسے سب تک پہنچا دو) اور اس کے ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی کہ رسول اللہؐ نے "دین کا مغز" کھلے بندوں دنیا تک نہیں

پہنچایا تھا، اسے سربستہ راز کے طور پر اس طرح سینہ بسینہ آگے منتقل کیا تھا کہ کسی اور کو خبر نہ ہونے پائے۔ یہ تھا تصوف۔ اس میں "مذہب" اپنے مقصد میں اور بھی کامیاب ہو گیا۔ مذہب کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ دنیاوی امور، دنیاداروں کے لئے ہیں اور مذہب کا کام عاقبت سنوارنا ہے۔ تصوف میں یہ عقیدہ اپنی انتہا تک پہنچ گیا۔ اس نے کہا کہ کشف و کرامات، خدا سے ہمکلامی اور رسول اللہؐ کے علم لدنی کی وراثت صرف اسی کو نصیب ہو سکتی ہے جو دنیا کو ترک کر دے۔ جس کے دل میں دنیا کا ذرہ بھر بھی خیال باقی رہا وہ اس راہ میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ اس مسلک نے ملوکیت کو یکسر بے لگام کر دیا۔ اسی جہت سے ہم نے تصوف کو مذہب کی انتہائی شکل قرار دیا ہے۔ یہاں پہنچ کر دین کا تصور کسی دھندلی سی شکل میں بھی باقی نہیں رہتا۔ مذہب کی رُو سے مقصد زندگی قرار پاتا ہے انفرادی نجات اور تصوف کی رُو سے انفرادی نجات (تزکیۂ نفس) کا ذریعہ قرار دیا جاتا ہے، ترک دنیا۔ ترک لذات!

اختلافات

جس نظریہ یا پروگرام کی صداقت کا معیار اس کے بدیہی اور ٹھوس نتائج ہوں، اس میں اختلافات کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ دنیا میں جس مختلف مقامات پر سائنس

اپنی اپنی تجربہ گاہوں میں، پانی کا تجزیہ کریں۔ ان سب کا نتیجہ عمل ایک ہوگا اس لئے اس باب میں ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ اختلاف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب آپ ٹھوس حقائق کی دنیا (MATTER OF FACT WORLD) سے الگ ہو کر محض نظری اور مجرّد (ABSTRACT) مباحث میں الجھ جائیں۔ دین کا نظام اپنی صداقت کے لئے ٹھوس نتائج کو معیار قرار دیتا تھا جو اسی دنیا میں سامنے آجاتے تھے۔ لہذا دین میں اختلاف کی گنجائش ہی نہ تھی۔ ایک قانون۔ ایک نظام۔ اس پر عمل پیرا ہونے والوں کی ایک جماعت۔ ایک نہجِ فکر۔ ایک طریقِ کار۔ لہذا ایک ہی نتیجہ۔ پھر تشتت و انتشار اور تباین و تخالف کہاں سے آسکتا تھا؟ لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہوگیا تو مذہب کی ساری گفتگو "آخرت" سے متعلق تھی، اور آخرت کسی کی آنکھوں کے سامنے تھی نہیں جو یہ معلوم ہو جاتا کہ مذہب کے دعاوی صحیح ہیں یا غلط۔ مثلاً ایک شخص آپ سے کہتا ہے کہ یوں نماز پڑھئے اس سے آپکی نجات ہو جائے گی۔ دوسرا کہتا ہے کہ نہیں یوں نہیں، یوں پڑھئے تب آپ کی نجات ہوگی۔ آپ کے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ کس طریق سے آپ کی نجات ہوگی۔ لہذا نظری عقائد اور ان اعمال و رسوم میں جن کے نتائج اگلی دنیا پر اٹھا رکھے جائیں، اختلاف لازمی ہے۔[1]

[1] فٹ نوٹ صفحہ ۸۸ پر دیکھئے۔

اس لئے اگر دین کی اُمّت واحدہ مذہب میں پہنچ کر بہتّر فرقوں میں بٹ جائے تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے؟ فرقہ بندی کو قرآن کریم نے شرک قرار دیا تھا اس لئے "مذہب" پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا تھا کہ اس میں فرقے کیوں ہیں؟ اس کے جواب کے لئے، وہی روایت سازی پھر کام آگئی۔ عربی کا ایک فقرہ (اختلاف امتی رحمۃ۔ میری اُمّت کا اختلاف رحمت ہے ا) تراشا گیا اور اسے منسوب کر دیا گیا اُس ذاتِ گرامی کی طرف جسؐ کی بعثت کا مقصود تمام دنیا کے اختلافات مٹانا تھا۔ جب یہ فقرہ حدیث بن گیا [سی] تو اختلاف کے رحمت ہونے میں کیا شبہ باقی رہا؟ قرآن گروہ بندی اور فرقہ سازی کو شرک قرار دیتا تھا۔ لیکن اس "حدیث" نے اسی شرک کو عین رحمت بنا کر دکھا دیا۔

یہ کچھ مذہب کی طرف سے ہو رہا تھا۔ دوسری طرف دنیا والے (اربابِ ملوکیت) باہم خانہ جنگیوں میں مصروفِ پیکار تھے۔ دین میں

ا اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم نے بھی احکام کے علاوہ حقائق کو بیان کیا ہے۔ لیکن ان حقائق کی سند خود قرآن کریم ہے۔ اس لئے جب سند ایک ہو تو پھر ان حقائق کے سمجھنے میں غور و فکر کے اعتبار سے فرقِ مراتب ہو سکتا ہے۔ اُمّت کے عمل میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔

اقتدار اشخاص کے ہاتھوں میں نہیں رہتا۔ لیکن ملوکیت میں تمام اقتدار واختیار انسانوں کے ہاتھوں میں آجاتا ہے۔ جب قوت کسی ایک انسان کے ہاتھ میں آجائے تو وہ یہی چاہے گا کہ وہ قوت اسکے ہاتھ میں رہے لیکن اسکے مخالفین چاہیں گے کہ قوت انکے ہاتھ میں آجائے۔ لہذا ملوکیت کے نظام میں حکومت کی وحدت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجانا بھی ضروری تھا۔

چنانچہ مذہب نے حالت یہ پیدا کردی کہ ملت کی عظیم اکثریت کو تو دنیا سے نفرت دلا کر "عاقبت سنوارنے" کے گورکھ دھندوں میں الجھادیا۔ اور نظری مباحث سے ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے، انہیں گروہوں اور فرقوں میں بانٹ دیا۔ دوسری طرف دنیا سمٹ کر چند افراد یا چند خاندانوں کے قبضہ میں آگئی اور ان میں ان کی تقسیم پر باہمی کشت و خون شروع ہوگیا۔

لہذا جس زمانے میں جنگ و جدل سے امن ہوتا تھا، ملت، مذہبی مباحثات و مناقشات میں الجھی رہتی تھی اور جب ارباب اقتدار میں باہمی جنگ ہوتی تھی تو مذہب اس جنگ کو جہاد کا نام دے کر ملت کو میدانِ جنگ میں لے جاتا تھا، جہاں ایک مسلمان کی تلوار دوسرے مسلمان کے سینے میں پیوست ہوتی تھی اور اس طرح ان میں سے قتل کرنے والا غازی اور قتل ہونے والا شہید قرار دیا جاتا تھا!
حالانکہ قرآن پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ مَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ

جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيمًا ○ (۴/۹۳) " جو ارادۃً کسی مومن کو قتل کر دے وہ سیدھا جہنم میں جائے گا جس میں ہمیشہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہوگی، اور اس کے لئے سخت عذاب تیار رہے گا" یہ خدا کا فرمان تھا لیکن اربابِ مذہب ان قاتلوں کو جنت کے پروانے تقسیم کرتے تھے۔ اس لئے کہ یہی ملوکیت کا تقاضا تھا۔ مذہب کا منصب ملوکیت کا استحکام (اور اس طرح اپنی بقا) تھا۔

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اگر کوئی شخص اس پر، تھوڑے سے وقت کے لئے بھی خالی الذہن ہو کر غور کرے گا تو وہ بلا تامّل اس نتیجے پر پہنچ جائے گا کہ یہ سب باتیں خلافِ عقل و بصیرت تھیں۔ اس لئے اس کے دل میں لا محالہ یہ سوال پیدا ہوگا کہ مذہب نے اس قسم کی باتوں کو منوا کیسے لیا؟ اسلام نہ سہی، وہ لوگ بالآخر انسان تو تھے۔ اگر وہ قرآنی بصیرت سے نہیں، محض انسانی دانش ہی سے کام لیتے تو مذہب کے ایسے کھلے ہوئے کمزور حربوں کا کبھی شکار نہ ہوتے!

مذہب بھی اس خطرہ کو محسوس کرتا تھا اس لئے اس نے اسکی روک تھام کی بھی فکر کر لی تھی۔

مذہب میں عقل کو دخل نہیں

دین اپنی دعوت کی شہادت کے لئے اپنے ٹھوس، تعمیری نتائج پیش کرتا تھا۔ اس لئے کہ اس کی دعوت یکسر علیٰ وجہ البصیرت تھی (اَدْعُوْا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ) لیکن یہی بصیرت مذہب کی دشمن تھی اس لئے مذہب نے یہ عقیدہ پیدا کیا کہ مذہبی معاملات میں عقل کو کچھ دخل نہیں ہوتا۔ جو عقلی توجیہات طلب کرے گا وہ ابلیسی گروہ میں شامل ہو گا۔ اس لئے کہ "اَوَّلُ مَنْ قَاسَ اِبْلِیْسُ" جس نے سب سے پہلے عقلی قیاس سے کام لیا تھا، وہ ابلیس تھا۔ اس کے برعکس جنت بیوقوفوں کے لئے ہے (اَھْلُ الْجَنَّۃِ بُلْہٌ) لہٰذا، جو کچھ تم سے کہا جاتا ہے، سوچے سمجھے بغیر اس پر عمل کئے جاؤ۔ مذہب نے اپنے پہلے مخاطبین سے تو یہ کہا۔ اور اس کے بعد آنے والی نسلوں سے یہ کہ تم صرف یہ دیکھو کہ تمہارے اسلاف کی روش کیا تھی۔ تم آنکھیں بند کر کے ان کی تقلید کئے جاؤ۔ یہی راہ صواب ہے یہی جنت کا سیدھا راستہ ہے۔

تقلید

یوں تو مذہب کی طرف سے لایا ہوا ہر نظریہ اور ہر تصور تباہی اور بربادی کا پیغامبر ہوتا ہے لیکن ان میں سے عقیدۂ تقلید کے اثرات سب سے زیادہ تباہ کن اور مضرت رساں ہوتے ہیں۔ غور کیجئے۔ حیوان اور انسان میں مابہ الامتیاز شے کون سی ہے؟ ظاہر ہے

کہ یہ عقل ہے۔ اب جس نظریۂ زندگی میں عقل کو سلب کر دیا جائے اس کی رُو سے انسان، حیوان بلکہ حیوان سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے عقل و دانش سے کام نہ لینے والوں کو شَرَّ الدَّوَابّ (بدترین خلائق) اور حیوانات سے بھی گئے گزرے ہوئے قرار دیا ہے (اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ) تقلید سے انسان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا۔ دل تو ہوتا ہے لیکن اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا۔ آنکھیں بھی ہوتی ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں۔ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا۔ کان بھی رکھتے ہیں لیکن ان سے کبھی سنتے نہیں۔ یہی ہیں جن کے متعلق فرمایا کہ یہ سیدھے جہنم میں جاتے ہیں (۷/۱۷۹)۔ ان کا مسلک زندگی یہ ہوتا ہے کہ جس روش پر اپنے اسلاف کو دیکھا۔ گوش بند و چشم بند و لب ببند۔ اس روش پر اندھا دھند چلے جاتے ہیں۔ اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ (۳۷/۶۹-۷۰) ان کا ٹھکانہ جہنم کے سوا اور کہاں ہو سکتا ہے۔ ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ (۳۷/۶۸) ذرا اس حقیقت کبریٰ پر غور کیجئے کہ قرآن نے اسلاف کی کورانہ تقلید کر لے اور اپنی عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کا مقام جہنم بتایا ہے۔ جنت اور جہنم کے قرآنی مفہوم کی تبیین کا یہ مقام نہیں۔ اس کے

متعلق کسی دوسرے وقت گفتگو کی جا سکے گی۔ اس وقت صرف اتنا دیکھ لیجئے کہ کائنات میں ہر شے اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جو شے کسی سبب سے آگے بڑھنے سے رُک جاتی ہے۔ وہ ختم ہو جاتی ہے۔ آفاقی دنیا کی طرح، انسانی دنیا میں بھی یہی قانون ارتقا جاری و ساری ہے۔ انسانیت کا ارتقاء علم و دانش کی راہ سے ہوتا ہے۔ ہر نئی نسل کے سامنے اس کے ماحول کے موانع و مشکلات ہوتی ہیں جنہیں سر کر لینے سے وہ نسل آگے بڑھتی ہے۔ اسی کا نام تخلیق مقاصد ہے۔ زندگی نام ہی تخلیق مقاصد کا ہے۔

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم

از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

مقاصد کی تخلیق جدّتِ فکر و ندرتِ خیال کی رہین ہوتی ہے۔ اگر کسی قوم میں فکر کی تازگی باقی نہ رہے، اس کے قوائے فکریہ معطل ہو جائیں تو وہ قوم تخلیق کی اہل نہیں رہتی۔ لہذا وہ قابل نمو (Dynamic) اور ذی حیات (organic) ہونے کے بجائے مٹی اور پتھر کا ڈھیر بن کے رہ جاتی ہے۔ اور مٹی اور پتھر سے جہانِ نو کی تعمیر نہیں ہو سکتی

لہ دیکھئے میرے مقالات "نجات" اور "ارتقاء" جو فردوس گم گشتہ میں شامل ہیں۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

قرآن، ارتقائی منازل طے کرنے والی قوم کو جنت کا مستحق قرار دیتا ہے اور کسی ایک مقام پر رُک جانے کا نام جہنم[1] رکھتا ہے۔ آپ دیکھا نہیں کہ اس نے جہنم کے ایندھن کے لئے اَلنَّاسُ (انسان) اور حِجَارَۃٌ (پتھروں) کو ایک ہی شق میں شمار کیا ہے (وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ)۔ قانونِ ارتقا کے ماہرین ہمیں بتاتے ہیں کہ کوئی ذی حیات، جس عضو سے کام لینا چھوڑ دے، رفتہ رفتہ فطرت اس عضو کو بے کار سمجھ کر اس کی افزائش (بلکہ پیدائش) ہی روک دیتی ہے۔ اسی طرح جب کوئی قوم سمجھ سے کام لینا چھوڑ دے، تو کچھ نسلوں کے بعد اس قوم میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ یہ ہے تقلید کا وہ تباہ کن اور دور رس اثر جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ اس سے صرف موجودہ نسل ہی تباہ نہیں ہوتی۔ اس قوم کی آنے والی نسلیں بھی برباد ہو جاتی ہیں۔ اس قوم میں "انسان" پیدا ہی نہیں ہوتے۔ حیوان پیدا ہوتے ہیں اور حیوان ہی مر جاتے ہیں۔ تقلید کی ان ہلاکت آفرینیوں

---

[1] جہنم کیلئے قرآن میں لفظ جحیم بھی آیا ہے جس کے معنی روک دینے کے ہیں۔

اور تباہ کاریوں کے پیشِ نظر قرآن نے اس شدومد سے اسکی مخالفت کی ہے۔ اس نے بتایا کہ ہر رسول کا پیغام، تقلید کی مخالفت کرنا تھا اور اسی بنا پر ان رسولوں کے پیغام کی سخت مخالفت ہوتی تھی۔ وہ مقلدین کو علم و دانش (یعنی دین) کی طرف دعوت دیتے تھے، اور یہ اسلاف کی تقلید کو حسن کارانہ شیوۂ زندگی ٹھہراتے تھے۔ خدا کے رسول اس قوم کو اس مسلک کے خلاف جھنجوڑتے تھے اور قوم اتنی ہی سختی سے اس کی مخالفت کرتی تھی ان کی مخالفت بھی بجا تھی۔ علم الحیوانات کے ماہرین بتاتے ہیں کہ کبھی چمگادڑ (خفاش) کی آنکھیں بھی دوسرے پرندوں کی طرح کھلی ہوئی تھیں۔ چمگادڑوں نے ان سے کام لینا چھوڑ دیا تو اب ان کی آنکھوں کی ساخت ہی ایسی ہوگئی ہے کہ وہ نورِ آفتاب کی تاب نہیں لا سکتے۔ اس لئے ان کا سب سے بڑا دشمن سورج ہوتا ہے۔ وہ تو یوں کہیئے کہ ان کا بس نہیں چلتا، ورنہ وہ کبھی سورج کو اُفق سے اُبھرنے نہ دیں۔ رسول، دین کی روشنی عطا کرتے تھے اور ان لوگوں کی حالت چمگادڑوں کی طرح ایسی ہوچکی تھی کہ انہیں اس روشنی سے سخت تکلیف پہنچتی تھی۔ اس لئے یہ اس کی مخالفت کرتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہر رسول کا یہی پیغام تھا اور ہر رسول کی اسی طرح مخالفت ہوتی رہی۔ وہ حضرت نوحؑ کے متعلق کہتا ہے کہ جب انہوں نے دین کی روشنی کی طرف دعوت دی

تو آپ کی قوم نے یہی جواب دیا کہ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ (۲۳/۲۴) "ہم نے یہ بات اپنے اسلاف کے ہاں نہیں سنی" اس لیے ہم اسے تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ یہی جواب حضرت صالحؑ کو ملا جب آپ کی قوم نے کہا کہ اَتَنْهٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (۱۱/۶۲) کیا تو ہمیں انکی عبودیت سے روکتا ہے جن کی عبودیت ہمارے اسلاف کرتے چلے آئے ہیں؟ یہی کچھ قوم شعیبؑ نے کہا (۱۱/۸۷) یہی جواب حضرت موسیٰؑ کو ملا۔ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (۱۰/۷۸) "کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اس راہ سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو دیکھا ہے؟ یہی قوم حضرت ابراہیمؑ نے کہا۔ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ (۲۶/۷۴) انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے اسلاف کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے۔" یہی جواب حضور نبی اکرمؐ کو ملا۔ سورہ لقمان میں ہے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (۳۱/۲۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو اسی کا اتباع کریں گے

جس کا اتباع ہمارے اسلاف کرتے چلے آئے ہیں۔

غور کیجئے۔ قرآن نے دین اور مذہب کا فرق کتنی وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ مذہب، اسلاف پرستی (تقلید) سکھاتا ہے۔ دین اس تقلید سے روکنے کے لئے آتا ہے تاکہ انسان وحی کی روشنی میں اپنی عقل و خرد سے کام لے۔ یہی شرف انسانیت اور احترامِ آدمیت ہے۔ لیکن تقلید پرست لوگوں کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ قرنہا قرن کی تقلید نے ان کی آنکھوں کو چمگادڑ کی آنکھیں بنا دیا ہوتا ہے اس لئے انہیں روشنی سے سخت تکلیف ہوتی ہے اور وہ اس کی مخالفت میں چلا اٹھتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ہر رسول کی دعوت کے ساتھ یہی ہوتا رہا (۴۳/۲۳) وہ تاریخی نظائر و شواہد سے بتاتا ہے کہ تقلید سے انسان کی نگاہ یہی غلط انداز ہو جاتی ہے کہ وہی عقل و دانش جو اس کے لئے مابہ الامتیاز تھی، اسے مار سیاہ بن کر دکھائی دینے لگ جاتی ہے۔ تقلید میں چونکہ مستقبل تاریک اور ماضی درخشندہ نظر آتا ہے۔ اس لئے انسان کی نگاہیں سامنے کی بجائے پیچھے کی طرف رہتی ہیں۔ اس کا منہ الٹا ہوتا ہے (یعنی آنکھیں گدی کی طرف ہوتی ہیں)، یہی جہنم کی زندگی ہے یَوۡمَ تُقَلَّبُ وُجُوۡهُهُمۡ فِی النَّارِ (۳۳/۶۶) "جس دن ان کے چہرے جہنم میں اُلٹے کر دیئے جائیں گے"۔ یہی وہ اوندھے منہ چلنے والے

ہیں۔ جن کے متعلق دوسری جگہ فرمایا کہ اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُکِبًّا عَلٰی وَجْھِهٖٓ اَھْدٰی اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۶۷/۲۲) "کیا وہ جو اپنے منہ کے بل اوندھا چلا جا رہا ہو سیدھے راستہ پر ہے یا وہ جو ہموار و متوازن راہ پر سیدھا چلا جا رہا ہو"۔ سورۂ یٰسین میں ہے کہ تقلید سے رسوم کہنہ کے طوق و اغلال اس بُری طرح گردن کو جکڑے رہتے ہیں کہ ان سے گردن اوپر کی اوپر اٹھی رہتی ہے اور انسان کو اپنے سامنے کا راستہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ اِنَّا جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَھِیَ اِلَی الْاَذْقَانِ فَھُمْ مُّقْمَحُوْنَ (۳۶/۸) "ہمارے قانون نے ان کی گردنوں میں ایسے طوق ڈال رکھے ہیں جو ان کی ٹھوڑیوں تک چڑھ گئے ہیں۔ جس سے ان کی کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ ان کے سر اوپر کے اوپر اٹھے رہتے ہیں"۔ اور یہ اپنے سامنے کا راستہ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ یہی وہ اطواق و اغلال تھے جنہیں اتارنے کے لئے رسول اکرمؐ تشریف لائے تھے (وَ یَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ (۷/۱۵۷)) جب ایک عرصہ کی تقلید سے قوم کے قوائے فکریہ اس طرح مفلوج ہو جاتے ہیں کہ وہ کام کرنے کے قابل ہی نہیں رہتے تو، قرآن کے الفاظ میں، اس قوم کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْھِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِھِمْ سَدًّا

فَاَغْشَیْنٰھُمْ فَھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ (۳۶/۹) ہمارا قانون فطرت ان کے سامنے بھی دیواریں کھینچ دیتا ہے اور ان کے پیچھے بھی۔ اور (ان کی عقل وحسن دید) پردے ڈال دیئے جاتے ہیں اور ان کی بصارت سلب کر لی جاتی ہے۔"

اسی حقیقت پر باندازِ دگر غور کیجئے۔ ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں اتنی استعداد نہیں رکھتا تھا کہ ہر نسل اپنے لئے آپ راہیں تراشے۔ عام راستوں سے ہٹ کر سوچنے والے انسان (یعنی مقاصد کی تخلیق کرنے والے دماغ) بہت کم پیدا ہوتے تھے۔ اسی لئے ہر آنے والی نسل کے لئے یہی راہ آسانی اور احتیاط کی تھی کہ وہ اپنے اسلاف کی باتوں کو جمع کر کے ان پر عمل پیرا ہوتی رہے۔ اسی کا نام تقلید ہے۔ یوں بھی، اُس زمانے میں زندگی کی رفتار ایسی سست تھی کہ نئے تقاضے جلدی جلدی سامنے نہیں آیا کرتے تھے۔ قرآن نے انسانیت کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اس نے کہا کہ اب عقل و علم کے خزانے عام کر دیئے گئے ہیں، اب ذہن انسانی سن رشد و بلوغت کو پہنچ چکا ہے اس لئے اب انسانوں کے لئے صحیح راہ عمل یہ ہے کہ وہ استقرائی علم سے اپنی راہیں آپ تراشیں۔ اس نے انسانی سعی و کاوش کو ناکامیوں اور نامرادیوں سے بچانے کے لئے وہ مستقل اصول

دیدیئے جو مرورِ زمانہ سے تغیر پذیر نہ ہوں، اور کہدیا کہ ان اصولوں کی روشنی میں ہر نسل اپنے زمانے کے تقاضوں کے حل آپ تلاش کرے مستقل اصول اس لئے از خود دیدیئے کہ عقل کا طریق تجرباتی ہوتا ہے اس کے سامنے جب کوئی نیا سوال آئے تو وہ اس کے حل کے لئے تجربۃً ایک راستہ اختیار کرتی ہے۔ لیکن بڑی جانکاہ مشقتوں کے بعد اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ راستہ غلط تھا۔ پھر وہ اسے چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کرتی ہے۔ عقل اس طرح ہڈیاں تڑواتی اور خون اور آگ کی خندقیں پھاندتی ناکام تجارب کی تلخیوں اور صعوبتوں کے بعد کہیں جاکر صحیح مقام تک پہنچتی ہے۔ وحی نے انسان کو ان تجربات کی مشقتوں سے بچانے کے لئے مستقل اصولِ حیات دیدیئے تاکہ وہ ان کی روشنی میں اپنی منزل تک بآسانی پہنچ جائے۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں وحی کا مقصد

(Economising Human Efforts)

ہے۔ لہذا انسان کے پاس وحی کی روشنی، اپنی عقل کی آنکھ، اور سابقہ نسلوں کے تجربات کے نتائج ہوتے ہیں۔ گزشتہ نسلوں کا تجربہ (جسے تاریخ کی یادداشتیں کہتے ہیں)، بڑی کارآمد شے ہے۔ اس لئے قرآن نے اس کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا۔ لیکن اس تجربے سے مستفید ہونے اور آنکھیں بند کرکے پرانی ڈگروں پر چلے جانے میں زمین

اور آسمان کا فرق ہے۔ یہ دین کا نظام تھا۔ لیکن مذہب نے آنے والی نسلوں کو اسلاف کی تقلید کی زنجیروں میں جکڑ کر آگے بڑھنے والی انسانیت کو پھر وہیں پہنچا دیا جہاں وہ انسانیت کے عہد طفولیت میں تھی اور اس طرح وہ انسان کی تاریخ کو ہزاروں سال پیچھے کی طرف لے گیا

مذہب، تقلید کے عقیدہ سے انسانوں کو اُس مقام پر پہنچا دیتا ہے جہاں ان میں سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔

نفرت ہی نفرت

اب آگے بڑھئے۔ دنیا سے نفرت اور علم و عقل سے دشمنی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر شے قابل نفرت بن جاتی ہے۔ چنانچہ مذہب پرست لوگوں کی نگاہیں کائنات کے ہر گوشے میں شر ہی شر دکھائی دیتا ہے۔ انہیں ہر حسین شے سے کراہت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر تبسم فشاں چہرہ انہیں موت کا آئینہ دار اور ہر گلفشاں پیشانی جہنم کا کندہ دکھائی دیتی ہے۔ جب بہار خوشی کے جھولے جھولتی ہے تو وہ ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں۔ جب چاندنی مسکراتی ہے تو وہ منہ لبسور لیتے ہیں۔ ان کے بجھے ہوئے چہرے اور نور مسرت سے محروم آنکھیں صاف بتا رہی ہوتی ہیں کہ یہ ان میں سے ہیں جنکی آرزوؤں کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ

آئے مجھے ہنسی بھی تو میں رو دیا کروں

حسن فطرت

ادب۔ موسیقی۔ آرٹ۔ سائنس، زیبائش و آرائش کے شگفتہ اسباب و ذرائع ان کے مذہب میں حرام ہوتے ہیں۔ دین، کائنات کے حسن سے بہرہ یاب ہونے اور اس حسن میں نت نئے اضافے کرنے کی تعلیم دینے کے لئے آتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات کی ہر شے اپنے اپنے مقام پر صحیح انداز میں رکھی گئی ہے۔ جب ہر شے اپنے اپنے مقام پر رہے تو اس کا ماحصل حسن کائنات ہوتا ہے۔ اس حسن (موزونیت) کے قیام و افزائش کے لئے، اور نوادر "ابلیس" کی بھی اپنے مقام پر ضرورت ہوتی ہے۔ حسن کی جلال آفرینیاں اور شعلہ انگیزیاں اسی کے ردعمل سے جلوہ تاب ہوتی ہیں لیکن اگر خیر سے خیر شے کو بھی اس کی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو وہ شر بن جاتی ہے۔ حسن، موزونیت کا نام ہے اور موزونیت یہی ہے کہ ہر شے اپنے صحیح مقام پر ہو۔ پسکال کے الفاظ میں "اگر قلوپطرا کی ناک ذرا چپٹی ہوتی تو تاریخی دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا" دین یہ بتاتا ہے کہ زندگی کے موٹر کار میں پٹرول کے ساتھ موبل آئل بھی لازمی ہے۔ شر اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب موبل آئل پٹرول کے ٹینک میں بھر دیا جائے۔ پھر گاڑی آگے نہیں چل سکتی۔ لہٰذا، دین کی رُو سے کائنات کے حسن سے حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے قلب و نگاہ میں جلا پیدا کرنا، انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما کا ذریعہ ہے۔

لیکن انسانوں کا خود ساختہ مذہب، کائنات کے ہر حسین نقشے پر ناک بھوں چڑھاتا اور اسے حرام قرار دیتا ہے۔

یہاں سے ایک اور گوشہ سامنے آتا ہے۔

حدود اللہ آپ قرآن میں دیکھئے۔ صرف چند چیزیں ہیں جنہیں حرام قرار دیا گیا ہے۔ چند باتیں ہیں جن سے روکا گیا ہے۔ اس میں متعین احکام کی فہرست بڑی مختصر ہے۔ باقی امور کے متعلق صرف حدود (BOUNDRY LINES) کھینچ دی گئی ہیں اور انسانی فکر کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے مسائل کا حل آپ تلاش کرے۔ قرآن حریتِ فکر پر کم از کم پابندیاں عائد کرتا ہے۔ اس کا مقصود انسانی صلاحیتوں کو ابھارنا ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا (جس نے نفس انسانی کی صلاحیتوں کو ابھارا اس کی کھیتی ثمر بار ہوئی)، اس کے برعکس مذہب کو دیکھئے تو وہ انسانی زندگی کے ایک ایک سانس پر داروغے مقرر کر دیتا ہے۔ وہ کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی اسکی اجازت نہیں دیتا کہ انسان اپنی عقل و فکر سے کوئی فیصلہ کر سکے۔ وہ بچہ کی پیدائش سے لے کر انسان کے مرنے تک (بلکہ مرنے کے بعد بھی) ایک ایک قدم پر اپنا حکم نافذ کرتا رہتا ہے۔ دایاں قدم اٹھاؤ تو یہ کہو۔ بایاں اٹھاؤ تو یہ پڑھو۔ پانی پیو تو یوں کرو۔ روٹی کھاؤ تو یہ کہو:

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ دین نے چند چیزوں کو حرام قرار دیا تھا۔

حرام و حلال

لیکن مذہب میں حلال اور حرام کی فہرستوں کو دیکھو کتابوں پر کتابیں بھری ہوئی نظر آئیں گی۔

قرآن میں چند چیزوں کو حرام قرار دینے کے بعد فرمایا۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ (۱۶/۱۱۶)

" اور دیکھو۔ ایسا نہ کرو کہ تمہاری زبانوں پر جو جھوٹی بات آجائے اسے بے دھڑک کہدیا کرو کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ چیز حرام۔ اس طرح (حرام حلال ٹھہرانا) اللہ پر افترا پردازی ہے (اس لیئے کہ اللہ نے جن چیزوں کو حرام ٹھہرانا تھا، وہ اس نے حرام قرار دیدی ہیں) کسی شے کو انسانوں کے لیئے حرام قرار دینا کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ انسانی آزادی کو ابدی طور پر جکڑنا ہے۔ اس لیئے دین میں یہ اختیار کسی انسان کو نہیں دیا جاتا۔ اس کا اعلان ہے کہ

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (۷/۳۲)

ان سے پوچھ کہ خدا کی زینتیں جو اس نے اپنے بندوں کے لیئے پیدا کی ہیں اور کھانے پینے کی اچھی اچھی چیزیں کس نے حرام کی ہیں۔؟

یعنی خدا کہتا ہے کہ ہمارے سوا اور کون ہے جو کسی چیز کو حرام قرار دیسکتا ہے ؟ مذہب کے اجارہ دار خم ٹھونک کر کہتے ہیں کہ ہم ہیں جو انہیں حرام قرار دیتے ہیں - وہ خدا سے علی الرغم کہتے ہیں کہ تم اپنی حرام کردہ چیزوں کی فہرست کو دیکھو اور پھر ہماری فہرستوں پر نگاہ ڈالو- خود بخود معلوم ہو جائیگا کہ حرام قرار دینے کے اختیارات کس کے وسیع ہیں ؟ حقیقت یہ ہے کہ دین جب ملوکیت اور مذہب میں بٹ جاتا ہے تو وہ اختیارات جو خدائے صرف اپنی ذات تک محدود رکھے تھے انسانی ہاتھوں میں منتقل ہو جاتے ہیں - ارباب حکومت اپنے دائرہ میں انسانوں کو اپنا محکوم بناتے ہیں- اور ارباب مذہب اپنے دائرہ میں انہیں اپنے تابع فرمان رکھتے ہیں- یہ حرام، وہ حلال، یہ کرو، وہ نہ کرو، سب مذہب کے استبدادی فرامین ہیں جو شاہی احکامات سے کسی صورت میں بھی کم نہیں- بلکہ اپنی گرفت کی شدت میں ان سے بھی زیادہ محکم- اس لئے کہ شاہی فرامین کا اثر تو وقتی ہوتا ہے لیکن مذہب کا استبداد دل کی گہرائیوں تک پہنچ چکا ہوتا ہے- حکومتیں آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں- لیکن مذہب کا غلبہ و تسلط ہمیشہ برقرار رہتا ہے- تخت و تاج کی حکومت میں وہ لذت کہاں جو مسا نید فتاویٰ کی حکومت میں ہے ؟

خدا نے انسان کو اختیار و ارادہ عطا کیا تھا- دین کا نظام اس اختیار

وارادہ میں وسعتیں عطا کرتا اور اس سے ایسے نتائج پیدا کرتا تھا جن سے انسانیت کو عروج وارتقا حاصل ہو۔ مذہب اپنے استبدادی احکام سے اس اختیار وارادہ کو کچلتا ہے۔ لہذا مذہب یکسر غیرانسانی زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ جب آپ خلاف انسانیت زندگی پر مجبور کئے جائیں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ

(۱) یا تو آپ کی انسانیت مسخ ہو جائے گی اور آپ شرف اختیار وارادہ کو چھوڑ کر جمادات و نباتات کی سی زندگی بسر کرنے لگ جائیں گے۔ (مذہب میں قوم کی اکثریت کی یہی حالت ہو جاتی ہے اس لئے وہ تقلید پر رضامند ہو جاتے ہیں)۔

(۲) یا آپ ان مستبدانہ پابندیوں سے ایسی سرکشی اختیار کر جائیں گے کہ پھر آپ ان حدود کا بھی احترام نہیں کریں گے جو دین نے اصولی طور پر متعین کئے ہیں۔ (اس قسم کے سرکش و بیباک۔ انسان بالعموم مذہب گزیدہ ہوتے ہیں)۔

(۳) اور یا پھر منافقت کی زندگی بسر کریں گے۔

شق سوم ذرا تفصیل طلب ہے۔ چونکہ مذہب کی پابندیاں انسان کی

منافقت

جائز آزادی کی راہ میں سنگ گراں بن کر حائل ہوتی ہیں۔ اس لئے انسان کا جی چاہتا ہے کہ ان پابندیوں کو

توڑ ڈالے۔ لیکن مذہبی زندگی کا تقدس اسے علانیہ ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتا، اس لیئے وہ فریب کارانہ راہیں تلاش کرتا اور بہانے تراشتا ہے وہ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے حسن فطرت سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کیف اندوز نہیں ہوتا۔ کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ موسیقی کو حرام قرار دیتا ہے لیکن مزامیر (سازوں) کے بغیر سُن لینے میں کوئی باک نہیں سمجھتا۔ اس سے بھی اس کی تسکین نہیں ہوتی تو وہ اسی موسیقی کو قوالی کا نام دے کر جزو عبادت بنا لیتا ہے۔ آرٹ اس کے نزدیک سخت قابل نفرت شے ہے۔ لیکن "ہاف ٹون" "تصویر" اترو الینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا۔ حسن اور اس کی نیرنگیوں کا تصور تک بھی اس کے نزدیک جہنم میں پہنچا دینے کے لیئے کافی ہوتا ہے لیکن وہ ایک "معشوق حقیقی" کی فریب انگیز اصطلاح میں حسن کی شعبدہ کاریوں اور بادۂ گلفام کی کیف باریوں کے سرود آور تذکرے جھوم جھوم کر سنتا ہے اور اس طرح ذہنی تسکین کوشش

لہ تصویر کے مسئلہ پر ایک مرتبہ، ہندوستان کی ایک نامور مذہبی ہستی نے جن کا اب انتقال ہو چکا ہے تفصیلی بحث کرنے کے بعد یہ ثابت کیا تھا کہ اوپر کے دھڑ (BUST) کی تصویر اتروانا جائز ہے۔ اسے انہوں نے (HALF — TONE) سے تعبیر کیا تھا، حالانکہ "ہاف ٹون" کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ماہرین نفسیات، نفسیاتی تجارب کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس قسم کے منافقانہ دباؤ (REPRESSION) سے جنسی بد نہادی (SEX PERVERSION)* پیدا ہو جاتی ہے جس کے مظاہرے بڑے گھناؤنے ہوتے ہیں۔ اسی جنسی بد نہادی کا نتیجہ ہے کہ غیر عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنے کے مدعی دھڑا دھڑ شادیاں کئے چلے جاتے ہیں اور بے حد و شمار لونڈیوں سے متمتع ہونا عین شریعت حقہ کے مطابق قرار دیتے ہیں۔ آپ مذہبی کتابوں کو دیکھئے۔ ان کا کتنا بڑا حصہ جنسیات سے متعلق مسائل پر مشتمل ہوتا ہے اور ان کا ذکر ایسی تفاصیل سے بیان کیا جاتا ہے کہ اس پر بے حیائی کی آنکھیں بھی جھک جائیں۔ دین نے صرف وہ پابندیاں عائد کی تھیں جو انسانی معاشرے کے نظم و ضبط کے لئے لاینفک اور انسانی نشو و نما کے لئے ضروری تھیں۔ ان کا نتیجہ غیر فطری

---

*(sex - perversion) کے لئے کوئی موزوں لفظ اس وقت میرے ذہن میں نہیں آرہا۔ بد نہادی۔ اسکا پورا پورا مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے۔ مسخ شدہ فطرت یا غیر فطری راہوں پر چل نکلنا اس کے مفہوم سے زیادہ قریب ہے لیکن اس کے باوجود یہ الفاظ بھی (sex -perversion) کا صحیح مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ غوایت کی مکروہ ترین شکل ہوتی ہے۔

دباؤ نہیں بلکہ دریا کو طغیانیوں سے بچانے کے لئے اس کے ساحلوں کا تعین تھا۔ مذہب نے اپنے غیر فطری استبداد سے دریا کے سامنے بند لگا دیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا پانی زمین دوز راہوں میں جا چھپا۔ اور جہاں جہاں اسے نرم زمین دکھائی دی وہیں سے سر نکال لیا اس لئے کہ ابھار پانی کی فطرت کا تقاضا تھا۔ آپ اس تقاضے کو روک نہیں سکتے۔

پری رو تاب مستوری ندارند
چو در بندی، ز روزن سر بر آرند

جن تباہیوں کا ذکر پہلے آچکا ہے وہ وہ تھیں جو مذہب نے خارجی دنیا میں پیدا کیں۔ اور جو خرابیاں اوپر مذکور ہیں وہ وہ ہیں جو اس کی وجہ سے دلوں کی داخلی دنیا میں وجود پذیر ہوئیں۔ ان خرابیوں نے پوری قوم کی سیرت کو مسخ کر دیا۔ جب کوئی قوم ایک عرصہ تک اس قسم کی منافقانہ زندگی بسر کرنے کی خوگر ہو جائے تو اس قوم سے جرأت و جسارت اور کشادگی و شگفتگی کے جوہر سلب ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ

مذہبی ضابطہ اخلاق

پست حوصلگی اور دوں ہمتی، تنگ نظری اور کوتاہ دامنی کے دنائت آمیز عیوب پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن مذہب ان عیوب کو محاسن بنا کر دکھانے کیلئے

ایک اور حربہ استعمال کرتا ہے جسے وہ "ضابطۂ اخلاق" کہہ کر پکارتا ہے وہ عاجزی اور ناتوانی کو خدا کے بندوں کی صفات قرار دیتا ہے۔ پست حوصلگی اور دوں ہمتی کا نام صبر اور توکّل رکھتا ہے۔ فاقہ زدگی کو استغنا کے پرفریب نقاب میں چھپاتا ہے۔ بے عملی کی افیون کو تقدیر الٰہی کا تریاق بنا کر دکھاتا ہے۔ بزدلی کا نام "مرنجاں مرنج" مسلکِ حیات رکھ دیتا ہے۔ دین یہ کہنے کے لئے آیا تھا کہ ہر وہ فساد انگیز قوت، جو رزق کے سرچشموں کو اپنے باپ دادا کی ملکیت قرار دے کر ان پر سانپ بن کر بیٹھ جائے اس قابل ہے کہ اس کی کلائی مروڑ کر، خدا کے دیئے ہوئے رزق کو خدا کے بندوں تک پہنچا دیا جائے۔ مذہب کا ضابطۂ اخلاق اس قسم کی لوٹ کھسوٹ کو "هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ" کہہ کر ان ناہمواریوں اور دراز دستیوں کو کھلا لائسنس عطا کر دیتا ہے۔ چونکہ مذہب کا دائرۂ اثر و نفوذ زیادہ تر غریب طبقے تک محدود رہتا ہے، اس لئے وہ ان لوگوں سے اپنے ضابطۂ اخلاق کو نہایت آسانی سے منوا لیتا ہے۔ باقی رہے ضابطے کے ایسے گوشے جن کا تعلق اس بالادست طبقے سے ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں امورِ دنیاوی کا نظم و انصرام ہوتا ہے، وہ انہیں وعظ و نصیحت کرتا رہتا ہے کہ ظلم کرنا بُرا ہے۔ غریبوں کو ستانا اچھا نہیں۔ ہر حقدار کو اس کا حق دینا ضروری ہے۔ سائل کو رد نہیں

کرنا چاہیئے۔ محتاج کو دھتکارنا معیوب ہے۔ مذہب اس باب میں اتنا ہی ضروری سمجھتا ہے کہ بالادست طبقہ کو اس قسم کے وعظ کہتا رہے اس کا نام اس نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر رکھ لیا ہے۔ جب بالادست طبقے کی طرف سے مفلوک الحال محتاجوں کی طرف کوئی بھیک کا ٹکڑا پھینک دیا جائے تو مذہب ان کی شان میں قصیدے کہنے شروع کر دیتا ہے اور ان غریبوں اور محتاجوں کو، جن کے غصب و نہب سے ان بالادستوں کی شان و شوکت قائم ہوتی ہے ھل جزاء الاحسان الا الاحسان کے خود ساختہ پر فریب مفہوم سے عمر بھر دعائیں دینے اور ان غاصبین کا بے دام غلام بنا رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

یہ ہے اس ضابطۂ اخلاق کی حقیقت جو مذہب کا عروۃ الوثقیٰ ہوتا ہے اور جسے وہ نہایت بلند آہنگ دعاوی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے قرآن ساری دنیا کو چیلنج دیتا ہے کہ اس کے متعین کردہ نظام (دین) کے ضابطہ کی کسی ایک شق کی مثل کوئی قانون مرتب کر کے دکھاؤ۔ دنیا ایسا قانون مرتب کر نہیں سکتی جس میں معاشی نظام حیات مستقل اقدار سماوی سے ہم آہنگ ہو۔ اس لئے دین، اپنے نظام میں بے مثل و بے نظیر ہوتا ہے۔ لیکن مذہب جس ضابطۂ اخلاق کو پیش کرتا ہے وہ دنیا کی ہر قوم میں مشترک ہوتا ہے۔ اس لئے کسی مذہب کا یہ دعویٰ کہ وہ

دوسرے مذہب پر فوقیت رکھتا ہے، بالبداہت باطل ہوتا ہے۔ ابھی (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے مسلک گاندھوی کی تائید میں اپنے پورے زور خطابت کے ساتھ۔ لکھا تھا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ ان "عالمگیر سچائیوں" سے مراد یہی ضابطۂ اخلاق تھا۔ یعنی جھوٹ نہ بولو۔ زنا نہ کرو۔ چوری نہ کرو۔ غریب کو نہ ستاؤ۔ وغیرہ۔ یہ سچائیاں واقعی تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس میں تو بلکہ مذہب کی بھی تخصیص نہیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو لامذہب کہتے ہیں اور خدا کی ہستی تک کے بھی قائل نہیں وہ بھی "ان عالمگیر سچائیوں" کے معترف ہیں۔ دنیا کا کوئی شخص بھی یہ نہیں کہتا کہ جھوٹ بولنا اچھا ہے اور چوری کرنا بڑا مستحسن فعل ہے۔ لہٰذا اگر اسلام بھی صرف یہی ضابطۂ اخلاق پیش کرتا ہے تو اس کے اس دعوے کے معنی کیا ہیں کہ کوئی انسان میری پیش کردہ تعلیم کی ایک شق کی مثل بھی پیش نہیں کر سکتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلام کی پیش کردہ تعلیم اس عام اخلاقی ضابطہ سے ماوراء کچھ اور ہے جس کی مثل و نظیر ناممکن ہے۔ یہ تعلیم ہے وہ نظام ربوبیت جو اسلام کا مابہ الامتیاز ہے اور جس کی نظیر دنیا کا کوئی نظام پیش نہیں کر سکتا۔ عام ضابطۂ اخلاق اس نظام کی تمہیدات میں آجاتا ہے[1]۔

---

[1] تفصیل کے لیے میری کتاب "نظام ربوبیت" دیکھیے۔

دینی نظام زندگی پیش کرتا ہے۔ لیکن مذہب کے پاس یہی عمومی ضابطۂ اخلاق ہوتا ہے اور اس کے ساتھ چند رسوم۔ مذہب پرستوں کا ایک طبقہ (جسے تصوف والے "اہلِ شریعت" کہہ کر پکارتے ہیں) اپنی گروہ بندی کو قائم رکھنے کے لئے دوسرے مذاہب سے برسرِ پیکار رہنے میں ہی اپنی بقا کا راز مضمر دیکھتا ہے۔ اس لئے وہ اس ضابطۂ اخلاق سے قطع نظر کرکے، غیر مذاہب والوں سے اپنے رسوم و مناسک کے اصلح و انفع ہونے پر مناظرے اور مباحثے کرتا رہتا ہے۔ لیکن مذہب کا دوسرا گوشہ جسے تصوف کہتے ہیں، ان رسوم و مناسک کی اہمیت کو کم کرکے، دوسرے مذاہب سے ضابطۂ اخلاق کے اشتراک پر آمادۂ مفاہمت ہو جاتا ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ یہ مفاہمت ایسی یک رنگ ہو جاتی ہے کہ رام اور رحیم ایک ہی سکّہ کی دو طرفیں قرار پا جاتی ہیں چونکہ تصوف کی دنیا جذبات کی پیدا کردہ ہے۔ اس لئے شاعری اسے خوب ہوا دیتی ہے۔ تصوف شاعری کے لئے نہایت وسیع میدان پیدا کرتا ہے اور شاعری تصوف کو حقیقت بنانے کے لئے وہ "دلائل" بہم پہنچاتی ہے جن کی حقیقت تشبیہات سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ اس طرح یہ شاعری بے عمل قوم کے لئے زندگی کا پرسکون بہانہ بن جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ شاعری ان کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے اور وہ اپنی خانقاہ

یا کمرے کے ایک گوشے میں بیٹھے تصور ہی تصور میں، زندگی کے مختلف مراحل و مدارج طے کئے چلے جاتے ہیں۔

افکار میں سرمست، نہ خوابیدہ نہ بیدار

جب کبھی زندگی کا کوئی مسئلہ سامنے آتا ہے، اس کے لئے کسی شاعر کا برجستہ شعر پڑھ دیا جاتا ہے، اور اس کے بعد سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ مسئلہ حل ہو گیا۔

مذہب اس سادہ لوح قوم کو اس طرح نظریات میں الجھائے رکھتا ہے اور ملوکیت کو کھلا چھوڑ دیتا ہے کہ وہ جسدِ انسانیت سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑے۔

کفر بعد از ایمان

جب قرآن کا لایا ہوا دین (عملی نظامِ حیات)، مذہب اور ملوکیت میں تبدیل کر دیا گیا تو وہ تمام جیتے جاگتے نتائج جو اس نظام کا فطری نتیجہ تھے معدوم ہونے شروع ہو گئے۔ اس لئے کہ قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ یہ نتائج 'قانون' کے ساتھ وابستہ ہیں، کسی قوم کے نام یا اسکی نراش خراش کے ساتھ نہیں۔ لہذا جب اس قوم نے جو اس ضابطۂ حیات کی اصلیت پر یقین رکھتی تھی، اسے ضابطۂ زندگی ماننے سے

عملاً انکار کر دیا تو اس پر کامرانیوں اور کامیابیوں کی راہیں مسدود ہو گئیں دیکھئے قرآن نے اس حقیقت کو کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے جب فرمایا کہ

كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ

بھلا خدا کا قانون اس قوم پر کس طرح عروج وارتقار کی راہیں کھولے جو اس قانون کے درخشندہ نتائج پر ایمان لانے کے بعد اس سے (عملاً) انکار کر دے۔

وَشَهِدُوْا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ

درانحالیکہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ اس نظامِ حیات پر عمل کرنے والے رسول کی جدوجہد نے کیسے تعمیری نتائج پیدا کئے تھے

وَجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ

اور اس طرح اس نظام زندگی کی واضح دلیلیں اس کے سامنے روشن ہو گئی تھیں۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ

اللہ کا قانون اس قوم پر عروج وارتقار کی راہیں کبھی نہیں کھولتا جو حقائق کو اپنی جگہ پر نہیں رہنے دیتی۔ (ظلم[1])

---

[1] ظلم کے معنی ہیں وضع الشئ فی غیر موضعہ المختص بہ (راغب) یعنی کسی
(باقی صفحہ ۱۱۶ پر)

أُولَٰئِكَ جَزَاءُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ
وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ (۳/۸۶-۸۷)

ان لوگوں کی اس روش کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان تمام نتائج حسنہ سے محروم رہ جاتے ہیں جو خدا کا قانون، اس قانون کو ٹھوس حقائق میں تبدیل کرنے والی کائناتی قوتیں اور انسانوں کا اجتماعی نظام پیدا کرتا ہے۔

ان آیات سے یونہی نہ گزر جایئے - یہ ایک عظیم الشان اصول کو بیان کرتی ہیں - یہ، کفر بعد از ایمان کا نتیجہ بتاتی ہیں۔ ایمان نے انسان کی پوری زندگی کو ناقابل تقسیم وحدت قرار دیا تھا۔ اس کے انکار نے اس نظام واحد کو دنیا اور آخرت کے الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر دیا اور اس طرح ملوکیت اور مذہب وجود میں آئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ دین کے نظام کے تمام ٹھوس نتائج سے محروم رہ گئے۔ ملوکیت اور مذہب دونوں

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۱۵) شے کا اس مقام پر نہ رکھا جانا جو اس کے لئے مختص ہے۔ جب کسی نظام کے پُرزے اپنی اپنی جگہ پر نہ رہیں تو اس سے اس کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ اس کا نام فساد یا سوء ہے جو حسن یا اصلاح کی ضد ہے۔ قرآن نے سورۃ نمل میں ظلم کو سوء سے تعبیر کر کے حسن کے مقابلہ میں رکھا ہے۔ (دیکھئے ۲۷/۱۱)۔

دین ہی کے الگ الگ ٹکڑے ہیں لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ الگ الگ ہوجانے سے ان دونوں میں دین کی کوئی بات بھی باقی نہیں رہتی۔ پانی کی مثال پر پھر غور کیجئے۔ پانی کا فطری خاصہ ہے کہ وہ آگ بجھاتا ہے۔ لیکن اسی پانی کے اجزائے ترکیبی کو جب الگ الگ کردیا جائے اور اس طرح پانی کا ہر قطرہ ہائیڈروجن اور آکسیجن میں تبدیل ہوجائے تو ان اجزاء کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ، آگ کو بجھانا تو ایک طرف ہائیڈروجن خود جلتی ہے اور آکسیجن دوسری چیزوں کو جلنے کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ کوئی چیز آکسیجن کے بغیر جلتی نہیں۔ یعنی پانی کے اجزائے ترکیبی میں سے کسی جزو میں بھی پانی کی خاصیت (PROPERTY) باقی نہیں رہتی بلکہ اس کے برعکس خاصیتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اسی طرح دین جب الگ الگ ٹکڑوں میں تقسیم کردیا جاتا ہے تو اس کے دونوں ٹکڑوں (حکومت اور مذہب) میں سے کسی میں بھی دین کی خصوصیات باقی نہیں رہتیں۔ بلکہ ان کی خصوصیات، دین کی خصوصیات کی ضد ہوتی ہیں۔ دین، وحدت پیدا کرنے آیا تھا۔ ملوکیت اور مذہب نے ملت کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔ اور یہ، قانونِ خداوندی سے اعراض برتنے کا فطری نتیجہ تھا۔ (جسے عذاب کہا جاتا ہے)

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ

عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ۔ (۶/۶۵)

ان سے کہہ دو کہ خدا کا قانون اس پر قادر ہے کہ (اس کی خلاف ورزی کرنے سے) تم پر خارجی دنیا سے عذاب لے آئے یا داخلی دنیا (تمہارے پاؤں کے نیچے) سے۔ یا تم گروہوں میں بٹ کر خلط ملط ہو جاؤ (اور اس طرح تمہاری وحدت ختم ہو جائے) اور تم ایک دوسرے کی شدت قوت کا شکار ہو جاؤ۔ دیکھو، ہم کس طرح ان حقائق کو پھیر پھیر کر تمہارے سامنے لاتے ہیں تاکہ تم ان پر غور و فکر کرو۔

ارباب مذہب، نتائج کو اعمال سے اتنا دور لے گئے کہ انہوں نے سب کچھ "آخرت" پر اٹھا رکھا۔ اس لئے ان کا دنیا میں کچھ حصہ نہ رہا۔ اہل حکومت نے اپنی تمام توجہات قریبی مفاد (دنیا) ہی پر مرتکز کر دیں۔ اس لئے ان کا حال تو خوشگوار ہو گیا۔ لیکن مستقبل روشن نہ ہو سکا۔ اس لئے کچھ عرصہ کے بعد ان سے حکومت و سلطنت بھی چھن گئی۔ غور کیجئے۔ قرآن نے حال (دنیا) اور مستقبل (آخرت) کے اس فرق کو کس قدر نمایاں

اور حال کے پیش پا افتادہ مفاد ہی کو مقصود و منتہیٰ سمجھنے والوں کے مآل کو کیسے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ سورۃ التوبہ میں ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ أَرَضِيتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ۝ (۹/۳۸)

اے وہ جو ایمان کے دعویدار ہو تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ[1] میں قدم اٹھاؤ، تو تمہارے پاؤں بوجھل ہو کر زمین پکڑ لیتے ہیں۔ کیا تم مستقبل سے بے فکر ہو کر قریبی مفاد کے پیچھے پڑ گئے ہو؟ اگر ایسا ہی ہے تو (تم نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ) قریبی مفاد تو مستقبل کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔

---

[1] فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (اللہ کی راہ) کے قرآنی مفہوم کے لئے آپ کو کچھ وقت اور انتظار کرنا ہوگا۔ سردست اتنا سمجھ لیجئے کہ قرآن اس اصطلاح کو بالعموم اس اجتماعی نظام کی اصطلاح کے لئے استعمال کرتا ہے جس کی بنیادیں مستقل اقدار (وحی) پر ہوں اور جو نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے قائم کیا جائے۔

اگر تم اس روش پر قائم رہے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟

إِلَّا تَنفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۹/۳۹)

اگر تم نے (مستقبل کی تابناکی کے لئے) قدم نہ اٹھایا تو یاد رکھو خدا کا قانون تمہیں اس کی بڑی دردناک سزا دے گا۔ یعنی تمہاری جگہ دوسری قوم کو لے آئے گا اور تم (اس انحراف سے) خدا (کے قانون) کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے (خود ہی تباہ ہو گے) یاد رکھو۔ اللہ نے ہر چیز کے لئے پیمانے مقرر کر دیئے ہیں جن پر اسے پورا پورا کنٹرول ہے۔

چنانچہ اس طرح، رفتہ رفتہ ان کی وسیع و عریض حکومتیں یا ختم ہو گئیں یا سمٹ سمٹا کر چھوٹی چھوٹی جاگیرداریوں (سلطنتوں) میں تبدیل ہو گئیں۔ ان چھوٹی موٹی سلطنتوں کی حالت یہ ہے کہ یہ مغرب کی بڑی بڑی حکومتوں کے رحم و کرم پر زندہ ہیں۔ جب تک اقوام مغرب کی سیاسی مصلحت کوشیوں کا تقاضا ہوگا یہ سلطنتیں قائم رہیں گی۔ جب ان کے مصالح کا تقاضا دوسرا ہوگا، انہیں ختم کر دیا جائے گا۔ ملت کی وحدت، مدت ہوئی ختم ہو چکی ہے۔ ان سلطنتوں میں اس شکل کا اتحاد بھی نہیں جس انداز کا

اتحاد مغرب کی غیر مسلم حکومتوں میں ہے۔ یہاں کیفیت یہ ہے کہ ایک سلطنت دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہے، اُس طرح جس طرح انکا ایک مذہبی فرقہ، دوسرے فرقہ سے نبرد آزما ہے۔ نتیجہ اس تشتت و افتراق کا یہ ہے کہ ان کا معاشرہ اور علمی سرمایہ، اُن کے تصوراتِ حیات، ان کے نظریاتِ زندگی، سب کے سب افسردگی کے پیغام بُردار ہیں اور موت کے نقیب۔

تمدن، تصوف، شریعت، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

اور یہ اس لئے کہ

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت، روایات میں کھو گئی

غور و تدبّر قرآن نے مسلمانوں کو قدم قدم پر دعوتِ فکر دی تھی۔ زمین و آسمان میں فکر، انفس و آفاق میں فکر، دنیا اور آخرت میں فکر۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ
فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (۲/ ۲۱۹-۲۲۰)

اس طرح اللہ اپنی نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم
دنیا اور آخرت میں غور و فکر کرو۔

اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اگر تم "عذاب النار" سے بچنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم ارض و سما میں غور و فکر کرو۔ اس غور و تدبر سے تم اس قانون خداوندی کا مطالعہ کر سکو گے جو کائنات کے رگ و پے میں جاری و ساری ہے، اور جب تم یہ معلوم کر لو گے کہ کائنات میں کونسا قانون نافذ العمل ہے جس سے محیر العقول سلسلہ اس قدر توازن و تناسب کے ساتھ اپنی ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھا جا رہا ہے، تو تم یہ بھی معلوم کر لو گے کہ تمہیں اپنی حیاتِ اجتماعیہ میں اس ہمہ گیر قانون کو کس طرح ایک مؤثر حقیقت بنانا ہے۔ یہی "اللہ کے ذکر" سے مفہوم ہے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ
اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ
يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ
وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ رَبَّنَا
مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ
النَّارِ ۝ (۳/۱۹۰-۱۹۱)

یہ ایک حقیقت ہے کہ ارض و سماوات کی تخلیق اور رات اور دن

کی گردشوں میں، ارباب دانش و بینش کے لئے (قانون خداوندی کی محکمیت اور ہمہ گیری کے) نشانات ہیں۔ وہ ارباب دانش جن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہمیشہ قانون خداوندی کو سامنے رکھتے ہیں اور ارض وسمٰوٰت کی تخلیق پر غور کرتے رہتے ہیں۔ اور اس انداز کے گہرے تدبر و تفکر کے بعد اس حقیقت کو اپنے سامنے مشہود دیکھ لیتے ہیں کہ اللہ کے نشوونما دینے والے قانون نے کائنات کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ تخریبی پہلو (تعمیری پہلوؤں پر) غالب آجائے اور اس طرح اس دنیا کو جہنم بنا دے۔ خدا کا تعمیری پروگرام ایسے تخریبی مآل سے کوسوں دور ہے۔

اس لئے یہ حقیقت بھی ان کے سامنے واضح کر دی تھی کہ جو لوگ غور و فکر سے کام لیتے ہیں وہ اگر تعداد میں تھوڑے بھی ہوں تو بھی ان لوگوں کی اکثریت پر غالب رہتے ہیں جو سمجھ سوچ سے کام نہیں لیتے۔

وَ اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ ۝ ۸/۶۵

اگر تم میں سو آدمی بھی ایسے ہو گئے (جو سمجھ بوجھ سے کام لینے والے ہوں)، تو وہ ہزار کافروں کو مغلوب کر کے رہیں گے۔ اس لئے

کہ کافروں کا گروہ ایسا ہے جو سمجھ بوجھ سے کام نہیں لیتا۔

یہ ہے دنیا میں قوموں کی کامیابی کا رازؔ۔ جب تک مسلمانوں کے سامنے قرآن کی یہ تعلیم رہی، انہوں نے اشیاء فطرت پر غور و فکر کرنا اور کائنات کی قوتوں کو اپنا تابع فرمان بنانا، فریضۂ زندگی سمجھا۔ لیکن جب مذہب کے تقلیدی فکر نے ان کے قوائے فکریہ کو مفلوج کر دیا تو عقل و فکر سے کام لینا ان پر حرام ہو گیا۔

ؔ قرآن نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا ہے کہ فطرت سے متعلق علم کو اگر مستقل اقدار سماوی (وحی) سے ہم آہنگ نہ کیا جائے تو اس کا نتیجہ تباہی و بربادی ہوتا ہے۔ سورۂ مومن میں ان اقوام سابقہ کے متعلق جو قوتوں اور ثروتوں کی مالک تھیں فرمایا کہ فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِندَهُم مِّنَ الْعِلْمِ جب ان کے پاس ہمارے فرستادہ واضح دلائل لیکر آئے تو انہوں نے یہ کہہ کر (منہ پھیر لیا) کہ جو کچھ ہمیں ہمارے علم نے دے رکھا ہے ہم اس پر مطمئن ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ (۴۰/۸۳) ان کو ان تباہیوں نے آ دبوچا جنہیں وہ ایک استحقار آمیز ہنسی سے ٹال دیا کرتے تھے۔ لہٰذا دین کا نظام یہ ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے ان کا استعمال مستقل اقدار سماوی (وحی) کے مطابق کیا جائے۔

عالم کسے کہتے ہیں قرآن نے عالم کا لفظ ان معنوں میں استعمال کیا تھا جن معنوں میں آجکل سائنٹسٹ (scientist) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ سورۂ فاطر میں دیکھئے کس طرح یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ فرمایا:

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً

کیا تم اس پر غور نہیں کرتے کہ اللہ کا قانون بادلوں سے پانی برساتا ہے۔

فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا۔

اور اس پانی (اور مٹی کے امتزاج) سے مختلف اقسام کے پھل پیدا کرتا ہے۔

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ

اور پہاڑوں میں سرخ و سپید مختلف رنگوں کے خطے ہیں۔ اور بعض ان میں سے (سنگ موسیٰ کی سی) سیاہی لئے ہوئے ہیں

وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ

(نباتات و جمادات کی دنیا سے آگے بڑھئے تو) انسانوں اور حیوانوں کی دنیا میں غور کیجئے کہ یہ کس قدر انواع و اقسام کی دنیا ہے

كَذٰلِكَ إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا

(۲۸ ۳۵/۲۷)

یہ کائنات اسی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ سو جو لوگ اس پر غور و فکر کے بعد، اس کے متعلق صحیح معلومات بہم پہنچا لیتے ہیں، وہی قانون خداوندی کی عظمت و کبریائی کا صحیح احساس کر کے اس کی خلاف ورزی سے لرزتے ہیں۔

غور کیجئے یہاں "علماء" کا لفظ استعمال ہی ان کے لئے ہوا ہے جو کائنات کے مختلف شعبوں پر غور و فکر کرتے ہیں (اسی کو سائنس کہتے ہیں) لہذا اس کا ترجمہ سائنٹسٹ ہے۔ ایسا سائنٹسٹ جو اپنی تحقیقات کے ماحصل کو وحیٔ خداوندی کے مطابق، نوع انسان کی بہبود کے لئے استعمال کرے۔ لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا، تو علماء کے معنی "لائبریرین" کے رہ گئے۔ آپ شاید حیران ہوں گے کہ میں نے مذہبی علماء کو لائبریرین کس طرح کہہ دیا؟ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ہاں سب سے بڑا عالم کون ہوتا ہے؟ وہ جو یہ بتا سکے کہ فلاں مسئلہ کے متعلق بخاری میں کیا لکھا ہے۔ فتح الباری نے اس کی تفسیر میں کیا بیان کیا ہے۔ علامہ آلوسی کا اس باب میں کیا ارشاد ہے۔ درمختار میں اس کی بابت، حواشی سعدیہ اور بدائع سے کیا منقول ہے۔ حسب یہ

نے ذخیرہ سے کیا نقل کیا ہے۔ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں کیا ارشاد فرمایا ہے۔ علامہ شامی نے شیخ ابن ہمام سے کیا نقل کیا ہے۔ جو سب سے زیادہ حوالے دے سکے وہی سب سے بڑا "مفتیِ دین" اور "حاملِ شرعِ متین" ہوتا ہے۔ یہ لائبریرین کا کام نہیں تو اور کیا ہے۔؟ چونکہ مذہب کی دنیا میں کسی معاملہ میں اپنی رائے کو دخل دینا سب سے بڑا جرم ہے اس لئے سب سے زیادہ صحیح جواب وہ ہوگا جس میں کہیں عقل کی بو نہ آنے پائے۔ اور یہ مسائل جن کے لئے ان ذخائر کتب کی اوراق گردانی وسطور شماری ہوتی ہے، ہوتے کس قسم کے ہیں؟ ایک عزیز دوست حج کے لئے عازم ہوئے تو میں نے خاص طور پر ان سے کہا کہ وہ وہاں مختلف ممالک کے علماء سے ملیں اور دیکھیں کہ وہ کن مسائل ومباحث پر گفتگو کرتے ہیں۔ واپسی پر میں نے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ وہ کم وبیش تمام علمائے مکہ ومدینہ اور دیگر ممالک اسلامیہ سے مل کر آئے ہیں۔ جن مسائل پر سب سے زیادہ گفتگو رہی وہ یہ تھے کہ جمع بین الصلوٰتین بالقصر فی عرفۃ والمزدلفہ (عرفہ اور مزدلفہ میں نمازوں میں۔ قصر بالجمع جائز ہے یا نہیں؟ قبروں میں نماز پڑھی جاسکتی ہے یا نہیں۔ سب سے زیادہ مرکوزِ توجہ یہ مسئلہ عظیمہ تھا کہ لاؤڈ اسپیکر پر نماز پڑھائی جاسکتی ہے یا نہیں۔ شیخ عبدالظاہر (امام حرم) اور شیخ عبدالمہیمن ابوالسمح (امام حرم)

اور شیخ عبد الرزاق مدیر مدرسہ دار الحدیث مکہ مکرمہ اور مولانا شیخ عبد الرزاق العفیفی الازہری، جیسے "علماء کبار" سب کے سب اسی اہم مسئلہ پر بحث کرتے تھے۔ ڈاڑھیوں کے متعلق بھی گفتگو تھی اور میز پر کھانا کھانے کے متعلق بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب "امور دنیا" کو دنیا داروں کے سپرد کر دیا جائے تو اہل مذہب کے لیے اور کون سے مسائل رہ جاتے ہیں جن پر گفتگو کی جا سکے۔ ان "علماء" میں ایک گروہ ان کا بھی ہے جو اپنے آپ کو "غیر مقلد" کہتا ہے۔ اس سے ناواقف لوگوں کو شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ شاید عقل و فکر سے کام لینے کے مدعی ہوں گے۔ لیکن یہ شبہ ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ مقلد اور غیر مقلد۔ فرقہ بندی کی اصطلاحیں ہیں عقل و فکر سے دونوں کو کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ مقلد ائمہ فقہ کی تقلید کرتے ہیں اور غیر مقلد روایات کی تقلید۔ مقلدِ ائمہ ہوں یا مقلدِ روایات تقلید کی تائید میں ان کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ ہم .... صحابہ کبار رض یا ائمہ فقہ رح کا اتباع کرتے ہیں۔ یہ کہتے وقت اتنا نہیں سوچتے کہ..... ...... صحابہ کبار رض یا ائمہ فقہ رح تو کسی کے مقلد نہیں تھے۔ وہ تو مسائلِ زندگی کا حل خود سوچتے تھے۔ لہٰذا ان کا اتباع تو یہ ہے کہ آپ بھی اپنے مسائلِ زندگی کا حل اسی طرح خود سوچئے جس طرح وہ حضرات خود سوچا کرتے تھے۔ یعنی حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے مسائلِ زندگی کا حل۔

غور کیجیے، کہ جس قوم کی یہ حالت ہو کہ ہزاروں برس سے اُس نے سوچنا ترک کر رکھا ہو کیا اس قوم میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت باقی رہ سکتی ہے؟ آبائی مسلک کا اثر کس قدر غیر مرئی بلکہ غیر محسوس اور کس درجہ گہرا اور تحت الشعور میں جاگزیں ہوتا ہے، اس کا اندازہ مختلف مثالوں سے لگ سکتا ہے۔ ایک مسلمان بچہ گوشت کی طرف لپک کر جائے گا، لیکن وہی گوشت ایک جینی لڑکے کے سامنے لائیے، اسے اس سے جھرجھری آجائے گی اور اس کی طبیعت متلانے لگے گی۔ اس کی طبیعت کا ایسا ردِ عمل کسی عقلی فیصلہ کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ طبیعت کا یہ ردِّ عمل یکسر غیر شعوری ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک مسلمان کو دیکھئے۔ قرآن نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان میں ایک وَمَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (۲/۱۷۳) بھی ہے۔ یعنی ہر وہ شے جسے اللہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کیا جائے۔ ہمارے ہاں پیروں اور اولیاؤں کی نیازیں روز دی جاتی ہیں۔ غیر اللہ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے ان کی حرمت بہ نص صریح ثابت ہے۔ لیکن چونکہ ہمارے گھروں میں ان کا عام رواج ہے، اس لئے ان نیازوں کو چھوٹے بڑے سب کھاتے ہیں۔ اور طبیعت پر اس کا کوئی ناخوشگوار اثر نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس، چوہا چونکہ کھایا نہیں جاتا۔ اگر وہ کھاتے وقت سامنے سے گزر جائے، یا اس کا ذکر تک بھی

آجائے تو متلی ہونے لگ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی کے شراب کے پیالے میں چوہیا گر جائے تو پینے والے کے نزدیک وہ شراب بھی "حرام" ہو جاتی ہے۔ یہ سب کچھ غیر شعوری طور پہ ہوتا ہے اور اس باب میں آپ کا ذہن کبھی اس طرف آنے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا کہ اس کے متعلق آپکی طبیعت کا ردِ عمل، سوچ سمجھ کا نتیجہ ہونا چاہیئے۔

انہی مثالوں سے اس حقیقت پر غور کیجئے کہ جب ایک قوم اپنے آباؤ اجداد کے مسلک پر تقلیداً چلی جا رہی ہو تو واقعات و حوادث کے متعلق ان کا ردِ عمل کسی غور و تدبر کا نتیجہ نہیں ہو سکتا، بلکہ ان کا ردِ عمل یکسر غیر شعوری ہوتا ہے۔ یہ لوگ جس بات کو غیر شعوری طور پر مستحسن مانتے چلے آرہے ہوں وہ مستحسن نظر آتی ہے اور جسے غیر شعوری طور پر مذموم سمجھتے چلے آرہے ہوں وہ مذموم ہوتی ہے۔ نہ اُسے مستحسن سمجھنے کے لئے ان کے پاس کوئی حقیقی دلیل ہوتی ہے۔ نہ اسے مذموم سمجھنے کے لئے کوئی بُرہان۔ انہیں، مناظروں اور مباحثوں کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اپنے مسلک کی "حقانیت" کے لئے دلائل تراشنے پڑتے ہیں۔ لیکن مناظرہ ہمیشہ فریقین کی ذاتی قابلیتوں کا مقابلہ ہوتا ہے۔ ہر فریق اس "ایمان" کے ساتھ سامنے آتا ہے کہ اس کا مسلک عین حق و صداقت کا مسلک ہے اور فریق مقابل کا مسلک غوایت و ضلالت

کی روش۔ اس "ایمان" کے بعد، ذاتی قابلیتوں کا تقابل ہوتا ہے۔ اور بس۔ جو زیادہ باتیں کرنا جانتا ہو وہ میدان مار لیتا ہے۔ اب مناظروں کا زور کم ہو گیا ہے تو اس کی جگہ پراپیگنڈہ نے لے لی ہے۔ جس گروہ کے پاس، پراپیگنڈہ کے اسباب و وسائل زیادہ ہوں، وہ دوسروں پر غالب آجاتا ہے۔ قرآنی حقائق اور علم و عقل کا سوال نہ پہلے تھا۔ نہ اب ہے۔

مذہب پرست مسلمان کی یہ حالت ہزار برس سے ہو رہی ہے۔ سوچئے کہ ان حالات میں فکر نو کا، جس پر قوموں کی زندگی کا انحصار ہے کہیں امکان بھی ہو سکتا ہے؟

معنیٔ تازہ کہ جوئیم و نیابیم کجاست؟
مسجد و مکتب و میخانہ عقیم اند ہمہ

صدیوں کی تقلید سے مسلمانوں کا ذہن مساجد کے حجروں اور خانقاہوں کے غاروں کی طرح تاریک ہو چکا ہے جس میں عقل کی روشنی کی کوئی شعاع کہیں سے بار نہیں پا سکتی۔ مسلمان کی آج حالت یہ ہے کہ

پست فکر و، دوں نہاد و، کور ذوق
مکتب و ملائے او محروم شوق

جب کسی قوم کا ذہن اس طرح تاریکیوں میں گھرا ہوا ہو تو اسے عروج و ارتقا کی راہیں نظر کس طرح آسکتی ہیں؟ اکثر تو حالت یہ ہوتی ہے کہ

أَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَاۤ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝ (۲۴/۴۰)

جیسے سمندر کی گہرائیوں میں تاریکیوں کی لہر پر لہر چڑھتی آ رہی ہو۔ آسمان پر گھنگور گھٹا چھا رہی ہو۔ اندھیرا ہے کہ اندھیرے کے اوپر چڑھے جا رہا ہے۔ ایسا اندھیرا کہ اپنا ہاتھ باہر نکالئے تو وہ بھی دکھائی نہ دے (یعنی دوسروں کا صحیح مقام متعین کرنا تو ایک طرف، خود اپنا مقام بھی دکھائی نہ دے) دکھائی کیسے دے؟ دکھائی تو دینا تھا دین کی روشنی سے۔ جب دین خداوندی سے روشنی نہ لی جائے تو روشنی کہاں سے ملے؟" مذہب خود تاریکی ہے، تاریکی سے تاریکی ہی ملے گی۔ روشنی کیسے مل سکتی ہے۔

یہ ہے حالت آج مسلمان کی۔ اس کی دنیا، ملوکیت کی لعنت میں گرفتار ہے۔ بادشاہتیں سرمایہ داریاں، جاگیرداریاں، زمینداریاں غرضیکہ معاشرتی اور معاشی زندگی کی تمام ناہمواریاں (جسے قرآن نے فساد فی الارض کہہ کر پکارا ہے) سب اسی لعنت کبیرہ کے مظاہر ہیں۔

اور اس کی "آخرت" مذہب کی تاریکیوں میں چھپی ہوئی۔ شریعت کے رسوم و مروّجات، علم کلام کے نظری مباحث۔ تصوّف کی نسُوں کاریاں، سب انہی تاریکیوں کے پیدا کردہ چھلاوے ہیں۔ اور ان کے اندر جکڑا ہوا بیچارہ مسلمان، حسرت بھری نگاہوں سے دوسری قوموں کو دیکھتا ہے اور اسکی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔

آں کہ گوید لا إلہٰ بیچارہ ایست
فکرش از بے مرکزی آوارہ ایست
چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر
سود خوار و والی و مُلّا و پیر

اب سوچئے کہ اس کے بعد اس کے سینہ میں روشنی کی کرن کہاں سے آسکتی ہے؟

باقی رہی نہ تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سُلطانی و مُلّائی و پیری

زوال کا بنیادی سبب

یہ ہیں "اسباب زوال اُمّت" اسباب، محض تفصیل کے اعتبار سے۔ ورنہ درحقیقت سبب صرف ایک ہے اور وہ ہے مسلمانوں کا خودساختہ مذہب۔ مذہب اور دین میں جو فرق پہلے بتایا جاچکا ہے اسے ایک مرتبہ پھر

سامنے لے آئیے تاکہ آپ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ میں (معاذ اللہ) لامذہبی یا الحاد (Atheism) کی تعلیم دیتا ہوں۔ دین اس ضابطۂ حیات کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے مکمل شکل میں اپنی آخری کتاب، قرآن کریم میں محفوظ کرکے دیدیا اور جسے اس کے آخری نبیؐ نے عملاً متشکل کرکے دکھایا۔ اس میں نہ ملوکیت تھی نہ سرمایہ داری۔ نہ پیشوائیت تھی نہ خانقاہیت۔ نہ فرقہ بندی تھی نہ گروہ سازی۔ ساری ملت ایک اُمتِ واحدہ۔ اس اُمت کا ایک نظام۔ اس نظام کا ایک مرکز۔ اس مرکز کے فیصلوں کی اطاعت تمام افراد کا فریضہ۔ اس کے برعکس، مذہب ان عقائد و نظریات اور رسوم واطوار کے مجموعہ کا نام ہے جو خود انسانوں نے وضع کئے۔ اس کا مقصود ہر فرد کی اپنی اپنی نجات، مکتی یا (salvation) ہے جو مرنے کے بعد حاصل ہوگی۔ اس دنیا سے اس کا کچھ تعلق نہیں۔ اس میں ملوکیت سرمایہ داری۔ پیشوائیت۔ خانقاہیت۔ فرقہ بندی۔ گروہ سازی۔ سب کچھ ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کتاب میں جہاں کہیں آپ کو دین کے مقابلہ میں مذہب کا لفظ نظر آئے اس سے یہی مفہوم لیجئے اور اس فرق کو ہمیشہ سامنے رکھئے تاکہ کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ حضرات انبیاء کرامؑ ہمیشہ خدا کا دین لاتے تھے لیکن ان کے نام لیوا، اُن کے بعد، اس دین کو مذہب میں تبدیل کر دیتے تھے۔

نبی اکرمؐ کے ظہور قدسی کے وقت دنیا میں، دین کہیں نہیں تھا۔ ہر جگہ

مذہبی مذہب تھا۔ دینِ اسلام، ان مذاہب کے خلاف چیلنج تھا۔ وہ انہیں مٹانے کے لئے آیا تھا تاکہ انسانیت ان زنجیروں سے آزاد ہو کر، صرف قوانینِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کرے۔ لیکن حضورؐ کی تشریف بر آری کے بعد، جو کچھ اقوامِ سابقہ نے اپنے اپنے دین کے ساتھ کیا تھا، وہی کچھ ہم نے کیا۔ ہم نے بھی، انہی کی طرح، دینِ خداوندی کو مذہب میں تبدیل کر لیا۔ لہٰذا، جو کچھ اقوامِ سابقہ کے ساتھ ہوا، وہی کچھ ہمارے ساتھ ہوا (اور ہو رہا ہے)

دنیا میں آج تک کسی "مذہب پرست" قوم نے ترقی نہیں کی نظر دوڑا کر دیکھئے: یہ حقیقت ہر طرف بکھری ہوئی دکھائی دے گی جس قدر کوئی قوم زیادہ "مذہب پرست" ہے اسی قدر وہ دنیاوی ترقیوں میں پست وزبوں حال ہے۔ تبت کے لاموں کے پیرو اور چین کے بدھ مت[1] کے متبع پورے کے پورے "مذہب" میں ڈوبے ہوئے ہیں، ان کی حالت ظاہر ہے۔ جن قوموں میں ایک طبقہ "مذہب پرست" ہوتا ہے اور دوسرا دنیادار، ان کا "مذہب پرست" گروہ دنیادار طبقہ کے مقابلہ میں پست حالت میں ہوتا ہے۔ ہندوستان میں سناتن دھرمی فرقہ

---

[1] اب تو وہاں بھی دہریت آ چکی ہے۔

کبھی آگے نہیں بڑھ سکا۔ خود یورپ میں عیسائی خانقاہوں کے "مذہب پرست" گروہ ہمیشہ پیچھے رہے۔ دنیا کے تھپیڑے رفتہ رفتہ ایسا کر دیتے ہیں کہ "مذہب پرست" طبقہ کے افراد، اُدھر سے کٹ کٹ کر دنیا داروں کی طرف آجاتے ہیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ اس قوم کی اکثریت "دنیا داروں" کی ہو جاتی ہے اور مذہب، عبادت گاہوں کی چار دیواری میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ جیسے آجکل یورپ میں عام طور پر ہو رہا ہے۔ جب یہ تھپیڑے اور شدت اختیار کر لیتے ہیں تو مذہب کو خارج البلد کر دیا جاتا ہے، اور پوری کی پوری قوم "خالص دنیادار" ہو جاتی ہے۔ جیسے روس میں ہوا ہے۔ یہی حالت مسلمانوں کی ہے۔ انکی اکثریت "مذہب پرست" ہے۔ اس لئے پست و زبوں حال۔ جو کچھ مذہب نے دوسری جگہ کیا ہے وہی کچھ ان کے ساتھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ دیکھئے اس حقیقتِ کبریٰ کو قرآن کریم نے کیسے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کا پیغام نوعِ انسانی کے لئے یکسر ہدایت و رحمت ہے لیکن

يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا (٢/٢٦)

اسی قرآن سے بہت سے لوگوں کو ہدایت ملے گی اور بہت سوں کے حصہ میں گمراہی آئے گی۔

قرآن ہی کے قانون کے مطابق تباہی

اس آیتِ جلیلہ پر

غور کیجئے۔ خدا کہتا ہے کہ اسی قرآن سے بہت سے لوگوں کے حصہ میں گمراہی آئے گی۔ وہی پانی جو زندگی کی اساس ہے انسان کی موت کا باعث بھی بن جاتا ہے۔ یہ کون ہیں جن کے حصہ میں اس قرآن سے بربادی اور تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ وَمَا یُضِلُّ بِہٖٓ اِلَّا الْفَاسِقِیْنَ گمراہی فاسقین کے حصہ میں آئے گی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ فاسقین کون ہیں؟ وہ کہتا ہے اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَ اللّٰہِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِہٖ "وہ لوگ جنہوں نے قانونِ خداوندی، کے مطابق نظامِ حیات قائم کرنے کا عہد کیا لیکن اس کے بعد اس عہد کو توڑ دیا" اس کی مزید وضاحت ان الفاظ سے فرمادی کہ وَیَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ۔ "ہاں! یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس چیز کو الگ الگ کر دیا جسے ملا کر رکھنے کا حکم خدا نے دیا تھا" خدا کے قانون نے یہ بتایا تھا کہ حیات ایک غیر منقطع وحدت ہے۔ طول میں بھی اور عرض میں بھی۔ طول میں دنیا اور آخرت، حال اور مستقبل میں کوئی حد فاصل نہیں۔ یہاں سے وہاں تک ایک مسلسل جوئے رواں چلی جاتی ہے۔ اس لئے دنیا اور آخرت کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ان کے لئے الگ الگ ضوابطِ زندگی تجویز کرنا، فسق ہے شرک ہے۔ اسی طرح عرض کی طرف وحدتِ انسانیت کے بجائے انسانوں کو افراد، شعوب، قبائل، اقوام میں تقسیم کر کے حد بندیاں قائم کر دینا بھی

اس وحدت کا قطع کر دینا ہے - اور یہ فسق ہے - اس فسق و شرک کا عملی نتیجہ یہ ہو گا کہ زندگی میں ناہمواریاں پیدا ہو جائیں گی (وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ) اور ایسی قوم کا انجام یہ ہو گا کہ وہ سخت ناکام و نامراد رہے گی (اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ) (۲/۲۶-۲۷)۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے ان مختصر سی آیات میں کیسے اہم، اساسی قانون زندگی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دین کا نظام، حیات کی وحدت کو عملاً قائم رکھنے کے لئے آیا تھا - یہ وہ نظام تھا جس کا نتیجہ اصلاح فی الارض (انسان کی تمدنی زندگی میں ہمواریاں) اور حسن مآب؛ مستقبل کی خوشگواریاں تھا - یہ صحیح راستہ (ہدایت) تھا - اس کے بعد قرآن کی حامل قوم نے اس وحدت کے ٹکڑے کر دیئے اور اس کے ساتھ ہی قرآن کے بھی ٹکڑے کر دیئے - اس کا نتیجہ فساد فی الارض (حال کی تباہی) اور خُسْرَانٌ فِي الْاٰخِرَةِ (مستقبل کی بربادی) تھا - اس کا نام قرآن کی اصطلاح میں ضلالت ہے - قرآن وہی تھا - لیکن جب اس قرآن کو لوگوں نے اپنی مرضی کے تابع رکھ کر اسے اپنے خیالات کے مطابق استعمال کرنا شروع کر دیا، تو وہ سرچشمۂ ہدایت ہونے کے بجائے ان لوگوں کے لئے گمراہی کا موجب بن گیا - یعنی یہ لوگ، بجائے اس کے کہ قرآن کو اپنا راہ نما سمجھتے، اسے اپنے مقاصد کو بروئے کار لانے کا ذریعہ

بنا بیٹھے۔ اس کا نتیجہ گمراہی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ دین میں قرآن ضابطۂ حیات تھا۔ "مذہب" میں پہنچ کر قرآن مردوں کو ثواب پہنچانے کا ذریعہ بن گیا۔ ہزار برس سے یہ قوم، بظاہر قرآن کو سینے سے لگائے پھر رہی ہے لیکن اس قرآن سے انہیں سوائے ضلالت اور خسران کے اور کچھ نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ کائنات کا قانون یہ ہے کہ ہر شے اپنے اصلی مقام پر ہی اپنے مضمر فوائد سے متمتع کر سکتی ہے۔ اسے اس کے صحیح مقام سے ہٹا دیجئے وہی شے ضرر انگیز ہو جائے گی۔ پانی کو کشتی کے نیچے رکھئے وہی پانی کشتی کی روانی کا ذریعہ ہوگا۔ اُسے کشتی کے اوپر لے آیئے، وہی پانی سیلاب بن کر کشتی کو لے ڈوبے گا۔ کسی شے کو اس کے صحیح مقام سے ہٹا دینا قرآن کی اصطلاح میں ظلم کہلاتا ہے۔ اس لئے قرآن نے بتا دیا کہ ظالمین کے لئے قرآن میں ناکامی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ "وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔" اور ہم نے قرآن میں جو کچھ نازل کیا ہے وہ ایمان والوں کے لئے شفا اور رحمت ہے "وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا" (۱۷/۸۲) لیکن جو اسے اس کے صحیح مقام سے ہٹا دیں، ان کے لئے اس میں خسارہ کے سوا کچھ نہیں۔ مسلمان کے کاروبار زندگی میں جو چیز گھاٹے کا موجب بن رہی ہے وہ، وہ قرآن ہے جسے اس کے صحیح مقام سے ہٹا دیا گیا ہے۔ قرآن جب اپنے حقیقی مقام پر تھا

تو دین کہلاتا تھا اور جب اس مقام سے ہٹ گیا تو اس کا نام مذہب ہو گیا۔
قرآن وہی ہے اس کا مقام بدل گیا ہے۔

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب بتدریج وہی "خوب" ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اسباب زوال آپ کے سامنے آ گئے اور اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اس زوال کو عروج سے بدلنے کی راہیں کون سی ہیں۔ بات صاف ہے اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات اس وقت ہماری قوم کی سمجھ میں شاید ہی آسکے۔

بیاں میں نکتۂ توحید آتو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ
(۱) قوموں کی زندگی اور عروج کے راستے میں سب سے بڑا روڑا "مذہب"

ہوتا ہے۔

(ii) کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی جب تک وہ "مذہب" کو نہ چھوڑے۔

(iii) دنیا کی دیگر اقوام نے جب ترقی کی طرف قدم اٹھانا چاہا تو انہوں نے

مذہب کو چھوڑ دیا۔ چونکہ ان کے پاس خدا کی طرف سے دیا ہوا دین نہیں

تھا، اس لئے ان میں سے بعض نے

(الف) مذہب کو مندر یا گرجا کی چار دیواری میں محدود کر دیا اور دنیا کے

معاملات، اپنی مصلحتوں کے مطابق طے کرنے شروع کر دیئے۔ اسے

سیکولرازم کہتے ہیں۔ اور یا

(ب) انہوں نے مذہب کو بالکل خیرباد کہہ دیا۔ یہ بھی سیکولرازم ہی ہے

(iv) مسلمانوں کے پاس، خدا کا دین اس کی اصلی شکل میں، قرآن کریم

کے اندر موجود ہے۔ اس لئے اگر انہوں نے زندگی اور عروج حاصل کرنا ہے تو

انہیں موجودہ مذہب کی جگہ خدا کا دین اختیار کرنا ہوگا۔

(v) لیکن اگر ہمارا مذہب پرست طبقہ اپنی ضد پر اڑا رہا، اور قوم سے یہی

کہتا رہا کہ دین وہی ہے جو ان کے ہاں اس وقت رائج ہے، تو اس کے بعد

دو شکلوں میں سے ایک شکل پیدا ہو کر رہے گی۔ یعنی

(الف) یا یہ قوم، بالکل تباہ ہو جائے گی۔ اور

(ب) یا یہ بھی مذہب کو مسجدوں کی چار دیواری میں محدود کر کے اپنے ہاں

سیکولرازم رائج کرے گی۔

دونوں صورتوں میں دین ان کے ہاں نہیں رہے گا۔ سیکولرازم سے دنیاوی مفاد عاجلہ تو انہیں میسر آجائیں گے لیکن یہ بھی، مغربی اقوام کی طرح، بین الاقوامی جہنم میں زندگی بسر کرے گی۔

آپ ان دونوں راستوں پر ایک مرتبہ پھر غور کیجئے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ یعنی خالص سیاست کی راہ جسے (SECULARISM) کہا جاتا ہے اور یا خالص دین کی راہ۔ یہ ہیں وہ دو راہیں جو "خودساختہ مذہب" کو چھوڑ کر اختیار کی جا سکتی ہیں۔ اگر ہم مزید ذلت و خواری سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں بہرحال اپنا موجودہ (خودساختہ) "مذہب" چھوڑنا ہوگا، اور اس کے بعد یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہم نے خالص دنیا (قریبی مفاد) کی راہ اختیار کرنی ہے یا حال و مستقبل دونوں کی درخشندگی کی دینی راہ۔ اس وقت ہماری یہ حالت ہے کہ ہماری اکثریت اپنی موجودہ پستی و زبوں حالی میں مگن ہے۔ وہ اپنی افیون کی پینک سے باہر آنا ہی نہیں چاہتی۔ بلکہ بالفاظ صحیح یوں کہیے کہ انہیں اس حالت میں مگن رکھا جاتا ہے اور انہیں پیہم افیون پر افیون کھلائی جا رہی ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں اقوام عالم کی دیکھا دیکھی اس پستی سے نکلنے کا احساس پیدا ہو رہا ہے۔ لیکن چونکہ صحیح راہ ان کے سامنے بھی نہیں

اس لئے وہ موجودہ خودساختہ مذہب کے اثرات سے باہر نہیں نکل سکتے۔ انکی کوشش یہ ہے کہ امورِ دنیا کے ساتھ کچھ اخلاقی اصول اور کچھ مسلمانوں کے سابقہ ادوارِ حکومت کے تعزیری قوانین (فقہی قوانین) اس طرح شامل کر جائیں کہ ہماری حکومتیں "اسلامی" بن جائیں۔ چنانچہ ان کے سامنے "اسلامی حکومتوں" کا نقشہ ہارون الرشید اور مامون الرشید کے زمانہ کا بھڑکیلا تمدن ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس قسم کی پیوند سازی سے یہ نظام کبھی دینی نظام نہیں بن سکتا۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن کو ایک بوتل میں بند کر دینے سے پانی نہیں بن جایا کرتا۔ اس امتزاج کے لئے ایک کیمیاوی عمل کی ضرورت ہے۔ اس عمل کیمیاوی کے بغیر، ایک ظاہری "اتحاد" تو پیدا ہو جاتا ہے۔ حقیقی ائتلاف[1] کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کے ظاہری اور خارجی پیوند کا نتیجہ الٹا خسران ہوتا ہے۔

اسلامی حکومتوں کی پیوند سازی

---

[1] قرآن اتحاد کے لئے ائتلاف کا تقاضا کرتا ہے (الف بین قلوبکم) اتحاد دو اجزاء کا ایک جگہ جمع ہو جانا ہے۔ ائتلاف ان کا ایک دوسرے میں ضم ہو جانا۔ اس نمط کہ وہ ایک بھی ہو جائیں اور اپنی انفرادیت بھی نہ کھوئیں۔ بلکہ وہ ایک ہوتے ہی اپنی انفرادیت کو مستحکم کرلے کے لئے ہیں۔

قرآن، کفر خالص کو بھی نتیجہ خیز بتاتا ہے (اس سے کم از کم قریبی مفاد تو حاصل ہو جاتے ہیں) اور دین خالص کو بھی نتیجہ خیز (جس میں حال اور مستقبل دونوں روشن ہو جاتے ہیں) لیکن وہ "کفر اور دین کی اس قسم کی امتزاجی کوشش کو نیم صداقت یعنی منافقت قرار دیتا ہے جس میں کوئی کوشش بھی بار آور نہیں ہوتی۔ سورۂ بقرہ کی اس آیت کو ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے جو اس سے پیشتر درج کی جا چکی ہے۔ بات واضح ہو جائیگی

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵)

کیا تم ایسی زندگی اختیار کر رہے ہو جس میں قانون کی بعض شقوں کو اختیار کر لو اور اس کے دوسرے حصوں کو الگ رکھ دو۔ یاد رکھو! جو قوم بھی اس قسم کی روش اختیار کرے گی اس کی اس کوشش کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہوگا کہ اسے حال کی زندگی میں بھی ذلت و رسوائی نصیب ہوگی۔ اور اس کے بعد بھی سخت سزا ملے گی۔

قرآن، دین کے نظام کو خالصتاً اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہے "شتر مرغی" انداز سے نہیں۔ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ (۳۹/۲-۳)۔

یہ ہے میرے نزدیک صحیح راہ عمل۔ یعنی ہمارے ہاں جو کچھ مذہب کے نام سے پیش کیا جاتا ہے۔ اسے قرآن کریم کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لیا جائے۔ جو اس پر پورا اُترے، اُسے دین خالص سمجھ کر رکھ لیا جائے۔ جو اس کے خلاف جائے، اُسے مسترد کر دیا جائے، خواہ اس کی نسبت کسی کی طرف بھی کیوں نہ کر رکھی ہو۔ دینِ خالص، خدا کی آخری اور مکمل کتاب کے اندر ہے۔ پھر اس دینِ خالص کی بنیادوں پر اپنا معاشرہ از سر نو متشکل کیا جائے۔ اس کے سوا، ہمارے لئے نجات و سعادت کی کوئی راہ نہیں۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے سر دست بہت کم لوگ اس کا صحیح مفہوم سمجھ سکیں گے (تا وقتیکہ وہ اس کا مطالعہ خالی الذہن ہو کر نہ کریں) اور جو اسے سمجھ سکیں گے، ان میں سے بھی بہت کم ایسے ہوں گے جو اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے اپنے اندر آمادگی پائیں۔ سمجھ اس لئے نہیں نہیں سکیں گے کہ انسانوں کا خود ساختہ مذہب اپنے اعتقادات و رسوم کو اس قدر مقدس بنائے رکھتا ہے کہ انسان اس کے خلاف ایک لفظ تک سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ کسی ملحد سے بات کیجئے تو وہ کم از کم عقلی دلائل تو سنے گا۔ لیکن "مذہب پرست" گروہ عقل کو پاس تک نہیں پھٹکنے دے گا۔ اور جو کچھ اس کے تقلیدی وراثت سے پہنچ چکا ہے اسے کسی کسوٹی پر پرکھنے کے لئے قطعاً تیار نہیں ہو گا۔ یہی وہ حقیقت ہے

جیسے قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (۳۵/۸)

جس کا برا عمل اس کے لئے خوشگوار بن جائے اور اسے نہایت حسین دکھائی دے کیا وہ کبھی سیدھے راستے پر آسکتا ہے؟ یہ ہے وہ قانون مشیت جس کے مطابق گمراہی اور ہدایت کا فیصلہ ہوسکتا ہے۔

جو شخص کسی بات کو غلط سمجھے، اُس کے راہ راست پر آجانے کی توقع ہوسکتی ہے۔ لیکن جو اسے سمجھے ہی بالکل صحیح، تو وہ اسے کس طرح چھوڑ سکتا ہے؟ اسی لئے رسول اللہؐ کو ارشاد ہوا کہ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ (۳۵/۸) جن لوگوں کی یہ کیفیت ہوچکی ہو انہیں راہ راست پر لانے کی فکر میں تو اپنی جان کیوں ہلاک کرتا ہے"؟

اور سمجھ جانے کے بعد عمل کرنا اس لئے دشوار ہوتا ہے کہ اس راہ میں ایسے ایسے معبود (اَنْدَادًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ) کھڑے ہوتے ہیں جن کا خود اپنے ہاتھوں سے توڑنا کسی خلیل اکبر ہی کا کام ہوسکتا ہے۔ نیز یہ کہ انسانوں کے خود ساختہ مذہب کی راہ ایسی تن آسانی کی راہ ہوتی ہے کہ اسے چھوڑ کر دین کی پیہم سعی و عمل کی راہ پر چلنا گویا لوہے کے چنے

چبانا ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ دین کی مخالفت ہمیشہ مترفین (تن آسان لوگوں) کی طرف سے ہوتی ہے۔ دین کے نظام میں ان کی تن آسانی اور عیش پسندی کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ مجھے ان تمام باتوں کا احساس ہے۔ لیکن بایں ہمہ میری قرآنی بصیرت نے مجھے جس نتیجہ تک پہنچایا ہے اُسے میں نے کاغذ پر محفوظ کر دینا ضروری سمجھا ہے، کہ آج نہیں تو آنے والی نسلوں میں شاید کوئی اس سے مستفید ہو سکے۔ اگر اُس وقت کوئی قرآن پر غور کرنے والا، اِس راستے پر چل نکلا تو اُسے میرے پاؤں کے نشانات دیکھ کر کم از کم اتنا اطمینان تو ہو گا کہ اس سے پہلے اس راہ سے کوئی اور بھی گزرا ہے۔

اور اگر میرے مخاطبین میں ایسے ارباب فکر و نظر موجود ہیں جو میرے ان نتائجِ فکرِ قرآنی سے متفق ہیں، تو مجھے اس سے بڑی مسرت ہو گی اگر وہ مجھے اس سے مطلع فرمائیں۔ کیونکہ دنیا میں جو رشتہ قرآنی فکر و نظر کی ہم آہنگی و یک نگہی سے پیدا ہوتا ہے اس سے زیادہ محکم رشتہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے اس ربط باہمی سے ہم اس مسئلہ پر مزید غور و فکر کر کے راستہ کی دشواریوں میں آسانیاں پیدا کر سکیں اور اس طرح قرآنی بصیرت کی شمع عالمتاب سے ان پردوں کو اٹھا سکیں جو ہزار برس کی تقلیدی تاریکیوں اور مذہبی ظلمتوں سے اس پر پڑے ہوئے ہیں (لِّنُخْرِجَ الَّذِيْنَ

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ) میرا ایمان ہے (اور میرا تجربہ اس ایمان کو محکم سے محکم تر کرتا جا رہا ہے) کہ جب تک ہم خالص قرآن کو اپنے سامنے نہیں رکھتے، دین کا نظام ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اور ہم کبھی وہ انقلاب پیدا نہیں کر سکتے جو قرآن نے ایک مرتبہ پیدا کیا تھا اور جسے ہر وقت پیدا کرنے کی قوت وہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہی وہ طریق کار ہے جو قرآن کی حامل قوم کے ذریعے ساری انسانیت میں ایک حسین انقلاب پیدا کر دے گا۔ وہ انقلاب جس میں دنیا یہ حقیقت عملاً سامنے دیکھ لے گی کہ

کس نباشد در جہاں محتاج کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

اس وقت ساری دنیا غیر خداوندی نظامہائے زندگی کے عذاب میں مبتلا ہے۔ اس میں مغرب کی وہ قومیں بھی شامل ہیں جو خدا کو مانتی ہیں لیکن ان کا نظام سیکولرازم ہے (مثلاً مغرب کی جمہوریتیں) اور وہ قومیں بھی جنہوں نے یکسر خدا کی ہستی سے انکار کر دیا ہے (مثلاً کمیونزم کی علمبردار حکومتیں)۔ انہیں اس جہنم سے نکلنے کا راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ قرآنی نظام میں یہ قوت ہے کہ وہ انسانیت کو اس جہنم سے نکال کر، جنتِ ارضی (اور اس کے بعد جنتِ اُخروی) کی طرف لیجائے۔ اگر ہم نے اس

نظام کے قیام کی ابتدا کردی، تو ہم خود بھی موجودہ جہنم سے نکل سکیں گے اور باقی دنیا کو بھی جنت کا راستہ دکھا سکیں گے۔ اور اگر ہم نے یہ راستہ اختیار نہ کیا تو خود بھی تباہ ہو جائیں گے اور دیگر اقوام کی تباہی کا بھی موجب بنیں گے۔

خدا کرے میری یہ حقیر سی آواز، پرخلوص دلوں میں اثر انگیزی کا موجب بن سکے۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

[اس مقالہ کی اشاعت کے بعد میرے پاس بہت سے استفسارات موصول ہوئے۔ ان میں سے بعض کے جوابات طلوع اسلام بابت جون ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئے تھے جو اس مقالہ کے چند اہم مقامات کی تشریح کرتے ہیں۔ ذیل میں ان سوالات اور جوابات کو بھی درج کر دیا جاتا ہے تاکہ اس مقالہ کی مزید وضاحت ہو جائے۔]

سوال (۱) آپ نے انسان کی مادی ضروریات کو بڑی اہمیت دی ہے اس کی روحانی ضروریات کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ کیا ہم یہ سمجھیں کہ انسان کا منتہیٰ انسان کی معاشی زندگی میں توازن پیدا کرنا ہے اور بس؟

جواب:۔ انسان کی بنیادی ضروریات سے مراد صرف روٹی کپڑا نہیں بلکہ وہ تمام اسباب و ذرائع ہیں جن سے انسان کی طبعی ضروریات بھی

پوری ہوں اور اس کے مضمر جوہروں کو کامل نشوونما کا بھی موقع ملے۔ یعنی افراد معاشرہ کی صلاحیتوں کے تکمیل پانے اور برومند ہونے کے لئے مواقع میسر ہوں اور اس کے بعد ان صلاحیتوں کو ایک نظام کے تابع ربوبیت عامہ کے لئے استعمال کیا جائے"۔ انسان کی مضمر صلاحیتوں کے "برومند" ہونے سے مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم نے جن صفات کو خدا کے اسماء الحسنیٰ کہا ہے، وہ (بشریت کی حدود کے اندر) انسان میں بیدار ہوتی جائیں۔ معاشی توازن سے یہی مراد ہے اور میرے نزدیک اسلام کا یہی منشا ہے۔ کیا کسی نظام کا یہ کارنامہ کم معرکہ آرا، محیر العقول اور قابل فخر و ناز ہے کہ وہ اس قسم کا معاشی توازن قائم کر دے۔ اور اس نظام کا قیام کسی ایک خطۂ زمین یا انسانوں کے کسی ایک گروہ تک محدود نہ ہو بلکہ اس کا دائرۂ عمل و نفوذ تمام دنیا کے انسانوں کو محیط ہو؛ علاوہ بریں اگر خالص "معاشیاتی" نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے تو یہ حقیقت ہے کہ ہم صبح سے شام تک معاشی مقاصد کے حصول کی جدوجہد میں مصروف سعی و عمل رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود معاشی ضروریات کی اہمیت سے انکار کرتے رہتے ہیں۔ یہ انکار دراصل غمازی کرتا ہے مادی زندگی کے متعلق اس تصور کی جو عیسائیت کی رہبانیت اور عجمی تصوف نے ہمارے ذہنوں میں پیدا کر رکھا ہے جس کی رو سے ہم مادی دنیا کو قابلِ نفرت سمجھتے ہیں۔ مادی زندگی اور اس کے

تقاضے کوئی ایسی شے نہیں جن سے جھینپ محسوس کی جائے۔ عملاً ہماری حالت یہ ہے کہ ہم میں سے بڑے سے بڑا روحانیت کا دعویدار بھی تھوڑی تک اسی دنیا کی ضروریات میں غرق ہوتا ہے۔ اور زبان سے ہم میں کا ہر شخص مادی دنیا پر لعنت بھیجتا ہے۔ اسلام اس قسم کی جھجک اور جھینپ کی زندگی کو منافقت کی زندگی قرار دیتا ہے۔ وہ حقائق کا بے نقاب سامنا کرتا ہے اور ہر حقیقت کا مردانہ وار اعتراف کرتا ہے۔ وہ معاشی خوشگواریوں کو خدا کی نعمتیں قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک معاشی خوشگواریوں کا حصول قابلِ نفرت نہیں، بلکہ قابلِ نفرت وہ نظام ہے جو ایسی معاشی ناہمواریاں پیدا کرتا ہے جس میں نوعِ انسانی کا بیشتر حصہ اپنی زندگی کی ابتدائی ضروریات سے بھی محروم رہ جاتا ہے چہ جائیکہ وہ اپنی انسانی صلاحیتوں کے نشوونما پانے کے اسباب و ذرائع ہر قدم پر موجود پائے۔ قرآن کے نزدیک حسنِ عمل کا تقاضا ہے کہ وہ اس قسم کے فساد انگیز (یعنی ناہموار) معاشی نظام کو مٹا کر اس کی جگہ عدل اور احسان کا متوازن معاشی نظام قائم کرے۔ فرمایئے کہ جس نظام کا مقصود یہ ہو، آپ کے نزدیک وہ نظام کچھ اہمیت نہیں رکھتا؟ اس نظام کے قیام اور قیام کے بعد بقا و استحکام کے لئے انسان کو جس قسم کی جدوجہد کرنی پڑتی ہے کیا اس سے بڑھ کر کوئی اور "روحانیت" بھی ہو سکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ لفظ "ثواب" کی طرح "روحانیت" بھی

ایک ایسا لفظ ہے جو آج تک شرمندۂ معنی نہیں ہو سکا۔ بولنے کو ہر شخص یہ لفظ بولے گا لیکن پوچھنے پر کوئی نہیں بتا سکے گا کہ اس لفظ سے اس کا مفہوم کیا ہے۔ وہ بہت دُور کی کوڑی لائے گا، تو کسی بزرگ کی کرامات گِنا دے گا۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ان "کرامات" سے کہیں بڑھ کر محیر العقول "کرامات" ہندو سنیاسیوں اور یوگیوں کے ہاں مل جاتی ہیں۔ لہٰذا اگر اسلامی تعلیم کا مغز اور منتہیٰ اس قسم کی محیر العقول کرامات ہیں اور اسی کا نام "روحانیت" ہے تو اس میں اسلام کی کیا خصوصیت ہے۔ یہ تو غیر مسلموں کے ہاں بھی ملتی ہیں۔ یاد رکھئے قرآن نے کہیں روحانیت کا مطالبہ نہیں کیا۔ اس کا مطالبہ "ربانی" بننے کا ہے اور اس کے معنی ہیں قوانین خداوندی کے مطابق نشو و نما دینے والے نظام کے حامل۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اس وقت تصور ہی نہیں کر سکتے کہ وہ نظام عدل و احسان جس میں ہر انسان اپنی تمام صلاحیتوں کے برومند ہونے کے مواقع یکساں طور پر موجود پائے گا کس قدر "روحانیت پرور" ماحول پیدا کر دے گا۔ یہی وہ ماحول ہو گا جس میں "زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی" یہی وہ ماحول تھا جس کی ایک جھلک آسمان کی آنکھ نے سرزمین عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر دیکھی تھی اور جسے دوبارہ دیکھنے کی تمنا میں وہ آج تک سرگرداں پھر رہا ہے۔

جسے تزکیۂ نفس کہا جاتا ہے وہ کوئی چیستان نہیں کہ "علم لدُنّی"
کے بغیر کسی کی سمجھ میں نہ آسکے۔ قرآن (اور عربی زبان) کی رُو سے تزکیہ کے
معنی ہیں، بڑھنا، پھولنا، بروئے کار آنا جسے (Growth یا Develepment)
کہتے ہیں۔ اور نفس کے معنی ہیں انسانی ذات کی صلاحیتیں۔ لہذا تزکیۂ نفس کے
معنی ہوئے انسانی صلاحیتوں کا نشو و نما پانا۔ اسی کا نام ربوبیت ہے۔
انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما، انسانی معاشرہ سے الگ ہو کر، زاویہ نشینی
اور خلوت گزینی کے چلّوں سے نہیں ہو سکتی۔ یہ ہو سکتی ہے عین انسانی
معاشرہ کے اندر۔ معاشرتی زندگی میں انسان کے سامنے نت نئے دن،
نئے نئے مسائل اور نئے نئے تقاضے آتے رہتے ہیں۔ انسانی صلاحیتیں
ان تقاضوں کے پورا کرنے کے لئے حسن کارانہ انداز سے سعی و عمل سے جلا
حاصل کرتی ہیں۔ اسی کشمکش سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ کسی شخص
کی صلاحیتیں کس قدر نشو و نما پا چکی ہیں۔ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ
مَعَهٗ نے اسی قسم کا معاشرہ قائم کیا تھا۔ انہوں نے چلہ کشی اور نفس کشی
سے اپنی "روحانیت" نہیں بڑھائی تھی۔ "روحانیت" بڑھانے کا وہ طریقہ
جسے تصوف "مغز دین" بتاتا ہے، عجمی تصور کی پیداوار اور انسانوں کے
خود ساختہ "مذہب" کی ایجاد ہے۔ دین، انفرادی زندگی نہیں بلکہ اجتماعی
زندگی سکھانے کے لئے آیا تھا۔ لہذا دین کے نظام میں رجسے معاشرتی

کہہ لیجئے یا معاشی) "صحیح روحانیت" کے بڑھنے کا راز پوشیدہ ہے۔ اسی نظام کی اہمیت کو اُجاگر کرنا میرا مقصود ہے۔ اس میں انسان کی موجودہ زندگی بھی شرفِ انسانیت کی حامل بن جاتی ہے۔ اور موت کے بعد کی زندگی بھی۔

مختصر الفاظ میں پھر سن لیجئے کہ دین کے نظام سے مقصود کیا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان، فطرت کی قوتوں کو مسخر کرے اور پھر ان کے ماحصل کو، قرآن کریم کے بتائے ہوئے پروگرام کے مطابق، نوعِ انسان کی بہبود کے لئے صرف کرے۔ اس سے، اس کی یہ دنیا بھی خوشگواریوں کی حامل ہوگی اور اس کے بعد کی دنیا (آخرت کی زندگی) بھی سرفرازیوں کی حامل۔ دنیا اور آخرت دونوں کی خوشگواریاں اور سربلندیاں مومن کی زندگی کا مقصود ہیں۔ اس کے علاوہ، قرآن کوئی اور "روحانیت" نہیں بتاتا۔

سوال ۷: آپ نے لکھا ہے کہ

(i) جو قوم اپنی کوششوں کو کائنات کے قانون سے ہم آہنگ کرتی ہے اس کی کوششیں بارآور ہوتی ہیں اور

(ii) اور جو قوم صرف اپنے لئے نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے سوچتی ہے اس کی "آخرت" بہتر ہو جاتی ہے۔

یورپ کی قومیں تسخیر فطرت بھی کر رہی ہیں اور اپنی آنے والی نسلوں کے غلبہ و تسلط کی فکر بھی کرتی رہتی ہیں۔ تو کیا آپ یورپ کی اقوام کو بہترین مومن قرار دیتے ہیں؟

جواب ۲

جی نہیں! میں یورپ کی اقوام کو "مومن" قرار نہیں دیتا۔ اگر آپ میرے مضمون کے دوسرے مقامات کو بھی ساتھ ملا کر دیکھتے تو اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے۔ میں نے اقوام یورپ کے متعلق واضح طور پر لکھا ہے کہ

گروہ اوّل:۔ وہ لوگ ہیں جو اپنے حال کی زندگی ہی کو زندگی سمجھتے ہیں اور آخرت کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنے حال کی زندگی کی کامیابیوں کے لئے تدابیر وضع کر رکھی ہیں اور وہ ان تدابیر پر عمل کرتے چلے جاتے ہیں ان سے انہیں پیش پا افتادہ مفاد حاصل ہو جاتے ہیں۔ اس گروہ کو کفار کا گروہ کہہ لیجئے جو مستقبل (آخرت) سے یکسر منکر ہے۔ آج اقوام مغرب اسی گروہ سے متعلق ہیں۔ ان کے سامنے مستقبل ہے تو صرف اپنی قوم (نسل) کا۔ وہ نوع انسانی کے مستقبل کی کوئی فکر نہیں کرتے۔ ان کا وحدتِ انسانیت پر ایمان ہی نہیں۔ نیز وہ زندگی کو فقط طبیعی زندگی مانتے ہیں جس کا سلسلہ سانس بند ہو جانے سے

منقطع ہو جاتا ہے۔ لہذا وہ زندگی کے مستقبل پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔ مستقبل سے یہاں مراد مرنے کے بعد کی زندگی ہے۔

ان اقتباسات سے واضح ہے کہ میں یورپ کی اقوام کو مومن اور متقی قرار نہیں دیتا بلکہ ان کا شمار ان میں کرتا ہوں جو آخرت کے منکر ہیں۔ ایک تو ان کے پیش نظر نوع انسانی کا مشترکہ مفاد نہیں بلکہ اپنی اپنی گروہ بندیوں کا مفاد ہے اور دوسرے وہ ظہور نتائج اعمال کے لئے حیات بعد الممات کے قائل نہیں جس کی وجہ سے انسان کی موجودہ زندگی کو وہ سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قرآن کا متوازی معاشی نظام قائم ہی نہیں کر سکتے" جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ اس قسم کا نظام صرف وہ قوم قائم کر سکتی ہے جو زندگی کو طول اور عرض دونوں میں غیر منقطع تسلیم کرے۔ یعنی وہ وحدت انسانیت کی بھی قائل ہو اور حیات بعد الممات کی بھی اور اس کے ساتھ ہی تمام انسانوں کے لئے وحدت قانون کی بھی۔ اور یہ تصور صرف قرآن دیتا ہے۔ یاد رکھئے کہ حیات بعد الممات محض ایک نظری عقیدہ نہیں کہ اسے مان لیا تو کیا اور نہ مانا تو کیا۔ یہ ایک عملی زندگی کی بنیاد ہے۔ اس عقیدہ کے انکار کے معنی یہ ہیں کہ انسان زندگی کو اس دنیا کی زندگی سمجھے۔ اس کے برعکس، اس کے اقرار کے یہ معنی ہیں کہ انسان اس حقیقت پر یقین رکھے کہ انسان کے جسم کے علاوہ اس کی ذات بھی ہے۔

انسانی صلاحیتوں کی صحیح نشوونما سے اس کی ذات میں استحکام پیدا ہوتا جاتا ہے اور وہ اس قدر مستحکم ہو جاتی ہے کہ طبعی جسم کے منتشر ہو جانے سے بھی اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ آگے چلتی ہے اور مزید ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ اس کا نام حیات بعد الممات ہے۔ دین اسلام کی بنیاد خدا کے دیئے ہوئے قوانین کی صداقت اور حیات بعد الممات کے واقعی اور حقیقی ہونے کے یقین پر استوار ہے۔

میں نے گذشتہ صفحات میں کہا یہ ہے کہ جو شخص اپنی کوششوں کو خدا کے قوانین سے ہم آہنگ کرے گا اس کی کوششیں نتیجہ خیز اور بار آور ہوں گی۔ پانی کے لئے قانون کائنات یہ ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہتا ہے جو کسان اپنا کھیت پانی کے نشیب کی طرف بنائے گا اس کا کھیت سیراب ہوگا۔ جو پانی کی سطح سے اونچا بنائے گا پانی از خود وہاں تک نہیں پہنچ سکے گا فطرت کی قوتوں کو اپنے کام میں لانے کا یہی طریق ہے۔ جو قوم تسخیر فطرت کرے گی اس کی کوششیں بار آور ہوں گی۔ اقوام مغرب اس نہج سے مسلمانوں سے آگے ہیں کہ وہ فطرت کے دبے ہوئے خزانوں کو کھود کھود کر باہر نکال رہی ہیں اور ان سے دھڑا دھڑ متمتع ہو رہی ہیں۔ انہیں مفاد عاجلہ (دنیاوی نعماء) نصیب ہیں۔ ہم ان سے محروم ہیں۔ صرف اس حد تک انکی کوششیں کائناتی قانون سے ہم آہنگ ہیں۔ ہماری کوششیں اتنی بھی ہم آہنگ نہیں۔

جن اقوام کو مفاد عاجلہ نصیب نہیں۔ زندگی اور اس کی حرارتوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ ان کے متعلق یہ سمجھنا فریب نفس ہے کہ اگر انہیں مفاد عاجلہ نصیب نہیں تو نہ ہوں۔ ان کی آخرت خوشگوار ہوگی! یہ حالت موجودہ مسلمانوں کی ہے۔

جنہیں مفاد عاجلہ میسر ہیں ان کے دو گروہ ہیں۔ ایک وہ جو صرف مفاد عاجلہ ہی کو مقصودِ زندگی سمجھتے ہیں اور انسانیت اور خود زندگی کے مستقبل (حیاتِ آخرت) سے انہیں کوئی تعلق نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس غیر متوازن نظامِ زندگی کے قیام کے ذمہ دار ہیں۔ جس کی بساط آج ہر طرف بچھ رہی ہے ان کا حال روشن ہے۔ لیکن مستقبل تاریک۔ لیکن اس کے باوجود یہ لوگ ان سے تو بہتر ہیں جن کا حال بھی تاریک ہے (یعنی جن کی قسمت میں "امروز" نہیں) اور مستقبل بھی تاریک ہوگا۔ اس اعتبار سے اقوامِ مغرب موجودہ مسلمانوں سے بہتر ہیں۔ کیونکہ ان کا (کم از کم) حال روشن ہے اور مسلمانوں کا حال اور مستقبل دونوں تاریک ہیں۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو مفاد عاجلہ کے حصول کی جد و جہد کے ساتھ ساتھ انسانیت اور زندگی کے مستقبل (آخرت) پر بھی نگاہ رکھتا ہے۔ یہ وہ ہیں جن کا حال بھی درخشندہ ہے اور مستقبل بھی تابناک۔ یہ گروہ پہلے گروہ سے بہتر ہے جس کا صرف حال ہی روشن ہے۔ یہ ہے وہ گروہ

جو اس قسم کے متوازن معاشی نظام کے قیام کا کفیل بنتا ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یہ نظام صرف اسی گروہ کے ہاتھوں قیام پذیر ہو سکتا ہے جو وحدتِ انسانیت اور وحدتِ حیات پر ایمان رکھتا ہو۔ قرآن اس نظام کے قیام کا عملی طریقہ بتاتا ہے، یعنی مفاد عاجلہ کے لئے اپنی کوششوں کو قانون کائنات سے ہم آہنگ کرنا اور ان کوششوں کے ماحصل کو مستقل اقدار (وحی) سے ہم آہنگ کر کے ایسے ماحول کا قیام جس میں انسانیت بڑھے، پھولے، اور پھلے۔ لہٰذا اس نظام کا قیام قرآنی ضابطے کے بغیر ناممکن ہے۔ اس نظام کی حامل قوم کو جماعتِ مومنین کہا جائے گا۔ اور یہی قوم دنیا کی امامت کی سزاوار ہوگی۔

سوال ۳؎ آپ نے لکھا ہے کہ اسلام ایک معاشی نظام قائم کرتا ہے۔ روس کی اشتراکیت کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ وہ ایک بہترین معاشی نظام قائم کرتی ہے۔ اس نے ایک حد تک اس نظام کو قائم کر کے بھی دکھا دیا ہے۔ پھر اسلام اور اشتراکیت میں کیا فرق ہے؟

جواب ۳؎

اول تو اشتراکیت کے معاشی نظام اور اسلام کے معاشی نظام میں

بہ حیثیت نظام بڑا فرق ہے۔ اشتراکیت کے نظام کی بنیاد "مساواتِ شکم" پر ہے۔ اس کے برعکس اسلام کا نظام ربوبیت ایک ایسا متوازن ماحول پیدا کرتا ہے جس میں نہ صرف روٹی کا مسئلہ ہی حل ہو جاتا ہے بلکہ ہر انسان کی مضمر صلاحیتوں کے نشوونما پانے اور برومند ہونے کے پورے پورے اور یکساں مواقع بھی میسر ہوتے ہیں۔ یعنی اس میں انسان کی معاشی ضروریات بھی پوری ہوتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس کی انفرادیت بھی قائم رہتی ہے۔ اشتراکیت میں انفرادیت یا انسانی ذات بُری طرح کچلی جاتی ہے۔ لیکن اصل فرق اساس و بنیاد کا ہے جس پر اشتراکیت اور اسلام اپنے اپنے نظام کی عمارت استوار کرتے ہیں۔ جیسا کہ میں اس سے پیشتر (سلیم کے نام دو خطوط میں[1]) لکھ چکا ہوں، اشتراکیت کا تصورِ حیات یکسر مادی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی اشتراکی موت کے بعد تسلسلِ حیات کا قائل نہیں۔ نہ ہی وحدتِ انسانیت کا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسا جذبۂ محرکہ ہے جس کی بنا پر اشتراکیین اپنا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ ان کے نزدیک زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے

---

[1] اشتراکیت اور اسلام کے معاشی نظام کا فرق سمجھنے کے لئے ان "خطوط" کا مطالعہ بہت مفید ہوگا، نیز میری کتاب نظام ربوبیت کا۔

اس لئے ان کے سامنے مفاد عاجلہ کے سوا اور مفاد آہی نہیں سکتا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ نوع انسان سے ہمدردی کا جذبہ وہ قوتِ محرکہ ہے جس کی بنا پر وہ اس قسم کا عالمگیر نظامِ معیشت قائم کرنے کے لئے مصروفِ جنگ و تازہ ہیں لیکن یہ جذبہ تو اخلاقی قدر (ETHICAL VALUE) کے ماتحت آتا ہے اور مادی نظریۂ حیات میں اخلاقی اقدار کا تصور بار ہی نہیں پا سکتا۔ یہ چیز بڑی دلچسپ ہے کہ ایک طرف تو کمیونزم کا میکانکی فلسفۂ زندگی اخلاقی اقدار کو مٹانے کا داعی ہے۔ لیکن دوسری طرف وہ اپنی تحریک کے قیام کے لئے دلیل اور جواز اخلاقی نظام سے مستعار مانگتا ہے' یاد رکھئے۔ میکانکی تصورِ حیات کا ماننے والا کبھی اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کہ "میں اپنی محنت کے ماحصل کو دوسرے کی بہبود کے لئے کیوں صرف کر دوں"؟ لہذا اشتراکی نظام، مادی نظریۂ حیات کے ماتحت یا تو ہنگامی جذبات کے زور پر قائم کرایا جا سکتا ہے یا پھر استبداداً۔ اس وقت عوام کو یورپین اقوام کے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جذبۂ انتقام کی بنا پر مشتعل کیا جاتا ہے اور یہی جذبہ کمیونسٹوں کے اس "جنون" کا ذمہ دار ہے جو ان کی مساعی میں اس قدر گرمجوشی پیدا کر رہا ہے۔ لیکن اس قسم کے منفیانہ جذبات پر کسی تعمیری انقلاب کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ مشتعل گشتہ انتقامی جذبات

فرد ہو جائیں گے تو پھر اس نظام کے قیام کا کوئی سہارا باقی نہیں رہے گا۔ اُس وقت اِس نظام کے ارباب حل و عقد، اپنی قیادت و سیادت، بلکہ اقوامِ عالم میں اپنی امامت کے تحفظ اور بقا کی خاطر، اس نظام کے قیام کے لئے عوام سے اسی طرح کام لیں گے جس طرح ہر دوسرے نظام میں مستبد طبقہ نچلے طبقہ سے کام لیتا ہے۔ چنانچہ اب خود روس کے ارباب حل و عقد اس کا اعلان کر رہے ہیں کہ اسٹیلن کا دور یکسر ظلم اور استبداد کا دور تھا۔ اس میں اسٹیلن کا قصور نہیں تھا۔ یہ اس نظام کا فطری نتیجہ ہے جس کی بنیاد میکانکی نظریۂ حیات پر رکھی جائے۔

علاوہ بریں اشتراکی نظام کی بنیاد انسانوں کے خود ساختہ اصولوں پر ہے اور یہ اصول نت نئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ ان اصولوں میں مارکس سے لے کر اسٹالین تک جو جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اس لئے ایسے نظام پر بھروسہ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔

اس کے برعکس اسلام جس متوازن نظام ربوبیت کا قیام چاہتا ہے وہ اس کی بنیاد وحدتِ انسانیت اور تسلسلِ حیات کے غیر متزلزل عقیدہ پر ہے (توحید خداوندی پر ایمان کا عملی مفہوم یہ ہے کہ کائنات میں صرف ایک ہی قانون نافذ العمل ہے جو تمام نوع انسانی پر یکساں طور پر حاوی ہے اور جس کے اثر و نفوذ کا دائرہ، طبیعی زندگی کے اختتام کے ساتھ

ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اس کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔ یہ قانون وحی کی رُو سے ملتا ہے اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے) دوسرے یہ کہ زندگی کی اساس (Base) ایک الوہیاتی توانائی (DIVINE ENERGY) ہے اور وہ ہر فرد کو یکساں طور پر عطا ہوئی ہے۔ وہ اس عقیدے کی بنیادوں پر ایک عملی پروگرام کی عمارت اٹھاتا ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس پروگرام میں شریک ہونے والے کی اپنی ذات میں ایک تغیر رونما ہوتا جاتا ہے۔ اس نفسیاتی تغیر کا نام تعمیرِ سیرت یا استحکامِ ذات ہے۔ داخلی طور پر نفسِ انسانی میں یہ تغیر رونما ہوتا جاتا ہے اور خارجی دنیا میں وہ نظامِ ربوبیت وجود کو ہوتا چلا جاتا ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس طرح ایک دائرہ بن جاتا ہے جس سے انسان کی داخلی اور خارجی دونوں دنیاؤں میں ربوبیت کا سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ ربوبیت (تربیت) کے معنی وہ طریق نشوونما ہے جس سے آہستہ آہستہ تدریجاً پانی کا قطرہ آغوشِ صدف میں گہر بن جاتا ہے۔ اس استحکامِ ذات سے انسان حیاتِ جاوید حاصل کر لیتا ہے اور موت اس کی زندگی کا خاتمہ نہیں کر دیتی۔ اس نظام کی اطاعت اکراہاً اور استبداداً نہیں کرائی جاتی بلکہ یہ خود نفسِ انسانی کی گہرائیوں سے پھوٹ کر نکلتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ یہ اطاعت اس نظامِ ربوبیت کا فطری نتیجہ ہوتی ہے ہوتی ہے۔ جب کھجور پک کر خود بخود شاخ سے

الگ ہو کر نیچے ٹپک پڑے تو اس کی یہ کیفیت اطاعت کہلاتی ہے۔ اس لئے اسلام کے نظامِ ربوبیت میں ہر "تربیت یافتہ نفس" (یعنی جس نفسِ انسانی نشو و نما اس نظامِ ربوبیت کی رُو سے ہو گی) اس نظام کی اطاعت (بلکہ یوں کہیئے کہ اس کے قیام و استحکام کے لئے جد و جہد میں شرکت) کا جذبہ اپنی ذات میں اُبلتا ہوا پائے گا۔ اسلام کے متوازن معاشی نظام سے مراد اس قسم کا نظامِ ربوبیت ہے، نہ کہ محض روٹی کا حل، اور ایسا حل جو مقصود بالذات بن کر رہ جائے۔ یعنی جب روٹی کا مسئلہ حل ہو جائے تو اس کے بعد انسانی نشو و ارتقا کے میدان بھی ختم ہو جائیں اور اس لئے اس کی سعی و عمل کے محرکات کے چشمے بھی سوکھ جائیں۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ فلسفۂ اشتراکیت اور اسلام کا نظامِ حیات، دو متضاد نظریات ہیں جن میں کسی صورت میں بھی مفاہمت نہیں ہو سکتی۔ اگر اشتراکیت کے معاشی نظام کے بعض اجزاء اسلام کے معاشی نظام کے بعض اجزاء سے ملتے ہیں تو اس سے اشتراکیت اور اسلام ایک نہیں ہو جاتے۔ ان دونوں میں بُعد المشرقین ہے۔ ایسا بُعد، کہ نہ کوئی اشتراکی، مسلمان ہو سکتا ہے، اور نہ ہی کوئی مسلمان اشتراکی ہو سکتا ہے۔ اسلام، نظامِ سرمایہ داری اور نظامِ اشتراکیت دونوں کے لئے چیلنج ہے۔

سوال ۷۴: آپ نے لکھا ہے کہ "مذہب" نے ملوکیت کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔ (یا ملوکیت نے "مذہب" کے ساتھ مفاہمت کر لی) کیا اس سے آپ کی یہ مراد ہے کہ بزرگانِ مذہب نے عمداً اور دانستہ ملوکیت کو تقویت دینے کے لئے اس قسم کا سمجھوتہ کر لیا؟ پھر آپ نے لکھا ہے کہ اس سمجھوتے ہیں روایات، فقہ اور تصوف نے ملوکیت کو بڑی مدد دی۔ کیا یہ چیزیں اسی مقصد کے لئے وجود میں لائی گئی تھیں؟

جواب ۷۴

میں نے نہ تو ملوکیت کے ضمن میں کسی بادشاہ کا نام لیا۔ نہ مذہب کے سلسلہ میں کسی بزرگ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میرا مقصود افراد نہیں بلکہ وہ نتیجہ ہے جس تک ہمیں تاریخ پہنچا رہی ہے۔ جہاں تک افراد کا تعلق ہے اسلاف کے متعلق میرا وہی مسلک ہے جو قرآن نے ہر مسلمان کے لئے متعین فرمایا ہے کہ اِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ (وہ ہمارے بھائی ہیں جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے رخصت ہو گئے) ملوکیت اور مذہب دو (Institutions) ہیں اور میری تنقید ان انسٹی ٹیوشنز ہی سے متعلق ہے، نہ کہ افراد سے۔ باقی رہا یہ سوال کہ کس نے دانستہ کیا کچھ کیا اور نادانستہ کیا کچھ، سو اس کا فیصلہ خدا ہی کر سکتا ہے۔ ہم اس امر کے لئے جج بننے پر مکلف نہیں۔ اس باب میں بھی میرا مسلک وہی ہے

جیسے قرآن نے حضرت موسیٰؑ اور فرعون سے مکالمہ کے ضمن میں فرمایا ہے کہ جب فرعون نے کہا کہ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی (اے موسیٰؑ یہ کہو کہ اسلاف کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے) تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ (ان کا علم اللہ کے ہاں ان کے نامۂ اعمال میں ہے)، بزرگانِ کرام میں سے جس کسی نے دین کی خدمت کی ہے ہم ان کے شکر گزار ہیں، لیکن تاریخ کی یہ حقیقت ہمارے سامنے ہے کہ جس نظامِ دینی کو محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے قائم کیا تھا، بعد میں وہ ثنویت میں تبدیل ہو گیا اور مذہب اور حکومت انسانی زندگی کے دو مستقل دوائرِ عمل قرار پا گئے۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ یہ کس طرح ہوا اور کن کے ہاتھوں سے، نہ ہی یہ کہ ایسا دانستہ ہوا یا نادانستہ۔ نتیجہ ایک سا ہی مرتب ہوتا ہے۔ اگر کوئی ماں اپنے بچے کو دوائی کی جگہ نادانستہ زہر کی پڑیا دیدے تو اس کا نتیجہ بھی اسی طرح موت ہوتا ہے جس طرح دانستہ زہر دینے کا نتیجہ - ہم آج اس زہر کو اس لئے تریاق نہیں کہہ سکتے کہ اسے نادانستہ دیا گیا تھا۔ جتنی جلدی اس زہر کو زہر کہدیا جاتا بہتر تھا تاکہ آنے والے بچے اس سے ہلاک نہ ہوتے، اور اگر اسے اس وقت تک زہر نہیں کہا گیا تو کسی وقت تو اس کی ابتدا ہونی چاہیئے! جب ہمارے پاس خدا کی طرف سے بھیجا ہوا

ایک یقینی معیار موجود ہے جو زہر کو زہر اور تریاق کو تریاق بتا دیتا ہے تو ہم اس پڑیا کو پرکھ کر کیوں نہ دیکھ لیں کہ زہر ہے یا تریاق۔

باقی رہا یہ کہ کیا روایات فقہ وغیرہ اسی مقصد کے لئے وجود میں لائی گئی تھیں سو ایسا نظر آتا ہے کہ جن لوگوں نے ان کی ابتدا کی تھی ان کا مقصد کچھ اور تھا، لیکن "عجم کی سازش" نے ان چیزوں کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا اور ایسا کرنے کے لئے پہلے یہ کیا گیا کہ انہیں ان کے اصل مقام سے ہٹا کر ایک نئی حیثیت دیدی گئی۔ ان کی یہ نئی حیثیت اس خرابی کا اصل موجب ہے اور جب تک انہیں ان کی اصلی حیثیت نہیں دیجائیگی یہ خرابی بدستور قائم رہے گی۔ دین کے غیر متبدل اصول قرآن کے اندر ہیں۔ ان غیر متبدل اصولوں کی جزئیات اُمتِ محمدیہ نے اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشاورت سے خود متعین کرنی تھیں۔ دین کی اصلی سند قرآن تھا اس لئے اسے یقینی طور پر محفوظ رکھا گیا۔ باقی چیزیں وقتی طور پر نافذ العمل رہنے کے لئے تھیں اس لئے انہیں محفوظ رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ عہدِ رسالتمآبؐ اور عہد صحابہؓ کرامؓ میں جب تک ان چیزوں کو یہی حیثیت دی جاتی رہی ان سے نفع ہی نفع برآمد ہوا، خرابی کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ بعد میں آنے والوں نے عہد سابق کی روایات کو اس لئے اکٹھا کیا کہ اُن سے اس عہد ہمایوں کی

تاریخ مرتب کرلی جائے۔ یہ تھا جمع و تدوین روایات کا جذبۂ محرکہ اور یہ تھا ان روایات سے مقصود۔ لیکن جب بعد میں ملوکیت کو اپنے قیام کے لئے مقدس سہاروں کی ضرورت پڑی تو انہیں اس کی جستجو ہوئی کہ یہ سہارے کہاں سے مل سکتے ہیں۔ قرآن سے یہ سہارے مل نہیں سکتے تھے۔ اس لئے کہ قرآن کا ہر حرف اپنی اصلی شکل میں محفوظ تھا جس میں نہ کسی تبدیلی کی گنجائش تھی نہ اضافے کا امکان۔ اگر کوئی شخص قال اللہ تعالیٰ کہہ کر ایک لفظ بھی ایسا اپنی زبان پر لاتا جو قرآن میں نہیں تھا تو ہزاروں ہاتھ اس زبان کو پکڑنے کے لئے بیک وقت اٹھ آتے۔ اس لئے کہ ہر شخص جانتا تھا کہ یہ قرآن میں نہیں ہے، اس پر اضافہ کیا جارہا ہے۔ لہٰذا ان سہاروں کے لئے کسی دوسری طرف رجوع کرنا پڑا۔ یہ گوشہ وہی ہو سکتا تھا جو قرآن کی طرح محفوظ نہیں تھا اور جس میں ہر قسم کے ردوبدل اور تحریف و الحاق کی گنجائش تھی۔ یہ روایات کا مجموعہ تھا۔ جھوٹی روایات وضع کرنے میں کوئی مشکل نہ تھی۔ لیکن روایات کو اس عہد کی تاریخ قرار دینے سے ان کا مقصد پورا نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے ان روایات کو دین قرار دے دیا گیا۔ بالکل قرآن جیسا دین (مثلہ معہ) بلکہ اس سے بڑھ کر۔ کیونکہ روایات قرآن کی ناسخ بھی قرار دی گئیں اور اس پر قاضی بھی۔ جب روایات کی حیثیت، تاریخ دین سے خود دین میں

(فٹ نوٹ صفحہ ۱۶۹ پر دیکھئے۔)

تبدیل کردی گئی تو پھر جس چیز کو چاہا دین بنا دیا - روایات سازی کی صدہا کامیاب کوششوں کا ذکر کتب جرح و تعدیل میں موجود ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ کتنی کوششیں ایسی تھیں جنہیں احتساب کی نگاہیں پکڑ نہیں سکیں۔ ان دانستہ کوششوں کے علاوہ، جو کچھ نادانستہ اور بڑی نیک نیتی سے ہوا، وہ بھی اپنی مقدار اور مضرت رساں نتائج کے اعتبار سے کچھ کم نہیں تھا۔ ظنیات کو جب بھی یقین کا درجہ دیدیا جائے ایسا ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

جہاں تک عہد رسالتمآبؐ کی تاریخ کا تعلق ہے، ہمارا ایمان ہے کہ اس میں کوئی بات قرآن کے خلاف نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے اس دور کی تاریخ کے پرکھنے کا معیار بھی قرآن کریم ہی ہے۔ اس میں جو بات ایسی نظر پڑے جو قرآن کریم کے خلاف ہو، اس کے متعلق ہمیں کہہ دینا چاہیئے کہ وہ صحیح نہیں۔

جو کچھ روایات کے بارے میں ہوا وہی کچھ فقہ کے ساتھ ہوا۔ فقہ ان جزئیات کا نام تھا جو ارباب تفقہ نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر اپنے وقت میں نافذ العمل ہونے کے لئے مدوّن کی تھیں۔ جب وہ زمانہ گزر گیا تو ان جزئیات کی حیثیت بھی تاریخ کی رہ گئی۔ یعنی یہ بتانے کے لئے کہ فلاں زمانے میں فلاں اصول کو یوں نافذ کیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں ان فقہی جزئیات کو بھی غیر متبدل قرار دے کر دین بنا دیا گیا۔ اس کے بعد

(فٹ نوٹ صفحہ ۱۶۸) روایات کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ
(i) وہ قرآن کی مثل اور اس کی ہم پایہ ہیں۔ (ii) اگر کوئی روایت قرآنی حکم کے خلاف نظر آئے (باقی صفحہ ۱۷۰ پر)

جس طرح روایات میں جو جی میں آیا اسے رسول اللہ صلعم کی ذات گرامی کی طرف منسوب کر دیا گیا اسی طرح فقہ کے متعلق بھی جو مناسب سمجھا گیا کسی امام فقہ کے نام سے مشہور کر دیا۔ اس طرح یہ چیز بھی ملوکیت کی تقویت کا ذریعہ بن گئی۔

باقی رہا تصوف تو اس کا تو تصور ہی اسلام میں ایک اختراع تھی۔ اگر تصوف نام ہے اعمال میں اخلاص کا تو اس کے لئے نہ کسی جداگانہ اصطلاح کی ضرورت تھی نہ کسی فن کی۔ اس لئے کہ وہ عمل جس میں اخلاص نہ ہو منافقت کہلاتا ہے یا بے معنی رسم۔ عمل با اخلاص ہی ان نتائج کا حامل ہو سکتا ہے جو قرآن نے اعمال صالحہ کے پرکھنے کے لئے واضح الفاظ میں بیان کر دیئے ہیں تاکہ اس باب میں کسی کے لئے کسی غلط فہمی، دھوکہ یا اشتباہ کی گنجائش نہ رہے لیکن تصوف نے اس ثنویت کو سند الوہیت عطا کر دی جو دین اور دنیا میں دوئی کا باعث بنی تھی اور جس سے ملوکیت نے اپنی زندگی پائی تھی۔ قرآن نے عیسائیت کے متعلق کہا تھا کہ اس میں رہبانیت بطور ایک بدعت اختیار کی گئی تھی لیکن وہ اس بدعت کو بھی نباہ نہ سکے۔ اس لئے کہ انسانی جذبات کو دبانے کی کوششیں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ قرآن ان جذبات کو دوسری سمتوں کی طرف منتقل کر کے، انہیں مفید نتائج کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔ رہبانیت انہیں دبانے کی کوشش کر کے

تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس نے قرآن کے حکم کو منسوخ کر دیا ہے۔ اس لئے کہ روایات قرآن پر قاضی اور حاکم اور اس کی ناسخ ہیں۔

انہیں مختلف زمین دوز راہوں سے نکلنے پر مجبور کرتی ہے انسانوں کا خود ساختہ
مذہب اسی قسم کے غیر فطری وباد کی زندگی سکھاتا ہے اور اس کا نتیجہ ہوتا ہے
وہ (PERVERSION) جس کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔ میں
یہ نہیں کہتا کہ ہماری کتب روایات و فقہ میں اس قسم کے (PERVERSION)
سے متعلق جتنا لٹریچر ملتا ہے وہ ان حضرات کا پیدا کردہ یا جمع کردہ ہے
جنہوں نے روایات یا فقہ کی پہلے پہل جمع و تدوین کی۔ نہ معلوم اس لٹریچر
میں کہاں کہاں کی چیزیں آکر شامل ہو گئیں اور کن راہوں سے یہ سانپ
حریم کعبہ میں آگھسے۔ لیکن جب ہم آج دیکھ رہے ہیں کہ کعبہ میں سانپ
چھپا بیٹھا ہے تو کیا ہم اسے محض اس لئے باہر نہ پھینکیں کہ یہ سانپ غلاف
کعبہ کے ساتھ لپٹا ہوا ہے؟ وقت ہے کہ ہم حریم کعبہ کو اس قسم کے بتوں
سے پاک کر دیں۔ ان بتوں کی کعبہ میں باریابی نہ منشائے خداوندی تھا نہ
مقصود رسالت، نہ بزرگان دین کے پیش نظر تھی، نہ مجتہدین ملت کا مدعا۔
ہماری بدبختی سے انہوں نے کسی نہ کسی طرح وہاں تک راہ پالی۔ اب سوال
یہ ہے کہ ان سانپوں کو کچل کر باہر پھینک دیا جائے یا اپنی عقیدتمندیوں کا
دودھ پلا پلا کر ان کی پرورش کی جائے؟ ہمارے ارباب شریعت کا ارشاد
ہے کہ ان کی پرورش کی جائے کیونکہ ہمیں یہ سب کچھ اسلاف سے ملا ہے۔
اور ہمارے اسلاف ہم سے بہتر سمجھتے تھے کہ غلط کیا اور صحیح کیا۔ میں یہ کہتا ہوں

(اور میرا ایسا کہنا قرآن کی دلیل اور تائید کے ساتھ ہے) کہ ہمارے پاس خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود ہے دین اس کے اندر ہے۔ یہی غلط اور صحیح کا معیار ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ جو کچھ ہمارے پاس منتقل ہو کر آیا ہے اسے قرآن کے معیار پر پرکھ لیا جائے۔ جسے وہ صحیح کہہ دے اسے رکھ لیا جائے۔ جسے وہ غلط کہہ دے اسے مسترد کر دیا جائے۔

میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہمارے زوال کا سبب انسانوں کا وہ خود ساختہ مسلک ہے، جسے "مذہب" کہا جاتا ہے۔ جب تک ہم اس مسلک کو چھوڑ کر ہر چیز کو قرآن کی روشنی میں نہیں پرکھتے (اسے دین کہتے ہیں) اس وقت تک ہمارے ابھرنے کی کوئی صورت نہیں۔

ایک خط

اور اسکا جواب

میرے جو خیالات سابقہ اوراق میں آپ کی نظروں سے گزرے ہیں انہوں نے فضا میں خاصا تحرک پیدا کر دیا۔ اس حد تک کہ میرے ایک شفیق دوست نے، ان سے متاثر ہو کر مجھے ذیل کا خط لکھا:-

پچھلے دنوں کئی آوازیں میرے کانوں میں یہ آئیں کہ
"پرویز صاحب کا یہ انداز خوب پسندانہ ہے کہ گذشتہ صدیوں میں اسلام
کی جتنی تعبیرات ہوئی ہیں وہ از الف تا ی غلط ہیں۔ اور سو فی صدی
صحیح تعبیر (INTERPRETATION) وہ ہے جو میں کر رہا
ہوں۔ ممکن ہے کسی خاص جملے سے یہ بات ظاہر نہ ہوتی ہو، لیکن
پوری تحریرات سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پچھلی صدیوں میں جہاں،
جب اور جو کچھ ہوا وہ سازش مجسم ہی کا نتیجہ تھا۔" اگر یہ اعتراض
جو آپ کی نگارش پر سننے میں آئے ہیں کسی حد تک صحیح ہو تو میری
مخلصانہ رائے ہے کہ اس روش میں ایک حسین ترمیم یوں کر دی جائے
کہ "پچھلوں نے جو کچھ بھی لکھا یا کیا ہے وہ سب کا سب سازش مجسم،
اس لئے کل کا کل غلط نہیں بلکہ ان کا بیشتر حصہ صحیح ہے۔ لیکن
بات صرف اتنی ہے کہ وہ تعبیرات اپنے اپنے ادوار کے لئے اور
اپنے اپنے عصری تقاضوں کے مطابق تھے۔ اب فلاں فلاں گوشوں کو
جدید مقتضیات میں ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ لہذا ان کی تعبیریں
یوں ہونی چاہئیں اور یہ تعبیرات بھی دائمی نہ ہوں گی۔ جب نئے تقاضے
سامنے آئیں گے تو یہ بھی نیا لباس پہن لیں گے۔" میرا خیال ہے کہ
یہ انداز زیادہ موثر اور جاذب اور حکمت تدریج کے مطابق ہو گا۔"

اس کے جواب میں میں نے یہ لکھا:-

گزارش ہے کہ میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ پچھلی صدیوں میں جہاں جب اور جو کچھ ہوا وہ سازش عجم کا نتیجہ تھا۔ اور جو تعبیرات میں پیش کر رہا ہوں وہ سو فی صدی صحیح اور دائمی ہیں

شق اول کے متعلق جو کچھ میں کہتا ہوں وہ فقط اتنا ہے کہ میرے نزدیک الدین منزل من اللہ (خدا کی طرف سے نازل شدہ) ہے اور وہ قرآن کے اندر محفوظ ہے جو کچھ ہمیں آج دین کے نام سے بتایا جاتا ہے اس میں جو بات قرآن کے خلاف ہے وہ صحیح نہیں ہے۔

اس کے جواب میں مجھ سے کہا جاتا ہے کہ جس چیز کو تم قرآن کے خلاف کہتے ہو وہ فلاں روایت میں لکھی ہے اور فلاں بزرگ کی کتاب میں درج ہے۔

میرا جواب یہ ہوتا ہے کہ میرے نزدیک نہ رسول اللہؐ کوئی بات (معاذ اللہ) قرآن کے خلاف فرما سکتے تھے اور نہ ہی میں ان بزرگوں کے متعلق ایسا گمان کر سکتا ہوں کہ انہوں نے قرآن کے خلاف کچھ پیش کیا ہو۔ لہذا یہ چیزیں رسول اللہؐ اور ائمہ ملت کی طرف غلط منسوب کر دی گئی ہیں اور یہی عجم کی سازش تھی۔ اگر اس پر بھی کسی کو اصرار ہے کہ نہیں! یہ باتیں رسول اللہؐ اور ائمہ کرامؒ ہی کی ہیں، تو میں صرف اتنا

عرض کر سکتا ہوں کہ یہ جرأت آپ کو مبارک۔ میں تو اس کے تصور سے بھی کانپتا ہوں کہ کسی ایسی بات کو جو قرآن کے خلاف ہو، (معاذ اللہ) رسول اللہؐ یا حضورؐ کے کسی سچے متبع کی طرف منسوب کیا جائے۔

اب رہا یہ سوال کہ اس کا کیا معیار ہے کہ فلاں بات صحیح ہے اور فلاں غلط سو اس کا جواب بالکل واضح ہے کہ اس کا معیار قرآن ہے۔

اگر آپ اس معیار پر متفق ہو جاتے ہیں، تو پھر بات بہت سہل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر کچھ فرق ہو گا تو قرآن کی تعبیر کا ہو گا۔ سند اور حجت کا نہیں ہو گا۔ میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ میری تعبیر سو فی صدی صحیح اور دائمی ہے۔ اس کے برعکس میں شروع سے آج تک مسلسل و متواتر کہتا چلا آ رہا ہوں کہ آپ یہ نہ دیکھئے کہ میں کیا کہتا ہوں۔ آپ از خود براہ راست قرآن پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ اصل دین کیا ہے۔ میری زندگی کا مقصد مسلمانوں کو براہ راست قرآن تک پہنچانا ہے اور بس!

میں نے آج تک جو کچھ لکھا ہے وہ قارئین کے سامنے ہے۔ میں ہر سوچنے والے کو ہمیشہ دعوت دیتا ہوں کہ وہ میری تحریر کو قرآن کے معیار پر پرکھے اور جہاں کوئی غلطی نظر آئے اس سے مجھے مطلع کرے جس کے لئے میں اس کا شکر گزار ہوں گا۔ اس کے جواب میں معترضین کی طرف سے آج تک کبھی کسی نے یہ نہیں لکھا کہ تمہاری فلاں بات

قرآن کے خلاف ہے۔ ہمیشہ یہ کہا ہے کہ تم حدیثوں کے منکر ہو اور اسلاف کے ناقد ہو۔ اس لئے مرتد ہو۔ کافر ہو۔ اور نہ جانے کیا کیا ہو؟

باقی رہا کسی تعبیر کا دائمی ہونا۔ سو اس کے متعلق میں متعدد بار لکھ چکا ہوں کہ ہم قرآن کو اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق ہی سمجھ سکتے ہیں۔ آنے والے زمانے میں جب علمی سطح اور بلند ہو جائے گی تو وہ لوگ قرآن فہمی میں ہم سے آگے بڑھ جائیں گے۔ اس لئے میں اپنی کسی تعبیر کو دائمی کس طرح کہہ سکتا ہوں؟ لیکن کسی تعبیر کا اصولِ قرآن کے خلاف ہونا اور بات ہے اور اس کا کسی ایک زمانے کی علمی سطح کے مطابق ہونا اور بات۔ میں جس بات کی مخالفت کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ کوئی تعبیر اصولِ قرآن کے خلاف نہیں ہونی چاہیئے۔

اب رہی میرے محترم کی ترمیم سو اس کے دو حصے ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآن کریم میں جن امور کا اصولی طور پر ذکر ہے ان کے جزئی قوانین ہر دور کے تقاضوں کے مطابق مدون کئے جائیں گے۔ مثلاً قرآن میں زکوٰۃ کا اصولی حکم ہے۔ اس کے جزئیات ہر دور کا قرآنی نظام خود متعین کریگا۔ اس باب میں یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ان امور کی جزئیات اپنے اپنے دور کے لئے اور اپنے اپنے عصری تقاضوں کے مطابق تھیں۔ اس چیز کو میں اپنی

تحریروں میں بار بار دہرا چکا ہوں اور میرے نزدیک اسلامی نظام کی بنیاد ہی اسی اصول پر ہے۔

دوسرا حصہ یہ ہے کہ کسی دور میں کوئی ایسا اصول وضع کر لیا جائے جو قرآن کے خلاف جاتا ہے تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکے گا۔ کہ وہ اصول اس دور کے لئے صحیح تھا اور اسے اب نئے سانچے میں ڈھالنا چاہیئے۔ یہ قرآن پر اضافہ ہے جو میرے نزدیک قطعاً جائز نہیں۔ مثلاً یہ عقیدہ کہ قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل کچھ اور بھی ہے (مثلہ معہ) اور یہ وہ مجموعۂ روایات ہے جسے رسول اللہؐ کے دو اڑھائی سو سال کے بعد لوگوں نے انفرادی طور پر مرتب کیا یہ ایک اصولی عقیدہ ہے جو قرآن کے یکسر خلاف ہے کیونکہ قرآن بے مثل و بے نظیر ہے۔ یہ عقیدہ نہ اپنے دور میں صحیح تھا نہ اسے آج ہی کسی اور سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک یہ عقیدہ خالص عجم کی سازش کا نتیجہ ہے کیونکہ اس سے بہت سی غیر قرآنی چیزوں کو عین اسلام بنانا بالکل آسان ہو جاتا تھا۔ دین اگر قرآن کے اندر محدود رہتا تو غیر قرآنی تصورات کو اسلام بنانے کی گنجائش ہی نہ رہتی۔ اس قسم کی خلاف قرآن چیزوں کے متعلق میں کہتا ہوں کہ یہ بلا تامل و توقف رد کر دینے کے قابل ہیں۔ بلکہ یہ کہ جب تک انہیں رد نہ کیا جائے حقیقی اسلام ابھر کر سامنے نہیں آسکتا۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں اس ضمن میں میرا مسلک۔ اس باب میں، میں نہ کسی حکمتِ تدریج کا قائل ہوں نہ اصول کو پس پشت ڈال کر انداز و اسلوب کو زیادہ موثر و جاذب بنانے کی مصلحت اندیشیوں کا حامی (حکمتِ تدریج کے اور معلم ہوتے ہیں) میرا خیال ہے کہ ہمیں اسی قسم کی مصلحت کوشیوں کے ہاتھوں یہ دن دیکھنے نصیب ہوئے ہیں۔ اس لئے کوئی وقت تو ایسا آنا چاہیئے جب ہم بلا محابا یہ کہہ سکیں کہ یہ کچھ دین ہے اور یہ کچھ دین نہیں۔ میں مبداءِ فیض کی اس کرم گستری پر قدم قدم پر سپاس گزار ہوں کہ اس نے مجھے یہ توفیق عطا فرمائی ہے کہ میں قرآن کے معاملے میں صاف صاف بغیر لگی لپٹی کے دو ٹوک بات کہہ سکوں اور اس پر بحضور رب العزت سجدہ ریز ہوں کہ

زہرِ دل در گذشتم ز درون خانہ گفتم
سخنے نہ گفتہ را چہ قلندرانہ گفتم

فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

اضافہ

آخر میں میں مختصر الفاظ میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ دینِ خداوندی قائم کس طرح ہوتا ہے۔ اس طرح کہ

(۱) ایک آزاد مملکت، امرِ الٰہی کی ... جس کا تمام کاروبار

قرآن کریم کے مطابق ہو گا۔

(۲) قرآن کریم میں کچھ احکام و قوانین، متعین شکل میں دیئے گئے ہیں۔ اور بعض اقدار اصول کے طور پر بیان ہوئی ہیں۔ قرآن کے احکام و قوانین ہوں یا اصول و اقدار سب غیر متبدل ہیں اور تمام مسلمانوں پر ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رہنے کے لئے دی گئی ہیں۔

(۳) جن اقدار کے صرف اصول دیئے گئے ہیں، مملکت کے ارباب فکر و نظر ——— نمائندگانِ ملت۔ ان اصولوں کی روشنی میں، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، ان کے جزئی قوانین مرتب کریں گے۔ ایسا کرنے میں وہ احادیث۔ تاریخ۔ فقہ کو اپنے سامنے رکھیں گے، اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق قوانین مرتب کریں گے۔ جو کچھ پیچھے سے چلا آرہا ہے، اس میں جو قوانین ایسے ہوں گے جو قرآنی اصولوں کے مطابق ہیں، اور جو ہمارے زمانے کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں، انہیں ویسے ہی رہنے دیا جائے گا۔ جن میں تبدیلی کی ضرورت ہوگی، ان میں تبدیلی کر لی جائے گی۔ جہاں نئے قانون کی ضرورت ہو، نیا قانون بنا لیا جائے گا۔ اس طرح قرآن کے اصول غیر متبدل رہیں گے اور ان کے ذریعے وضع کردہ قوانین زمانے کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ بدلتے رہیں گے۔ یوں مستقل اور قابلِ تغیر و تبدل

عناصر کے حسین امتزاج سے، کاروانِ ملت آگے بڑھتا چلا جائے گا۔
(۴) دین کا مقصد، انسان کے، اس دنیا کے معاملات کو اس طرح حل کرنا ہے کہ اس سے وہ فساد (ناہمواری)، ختم ہو جائے جس کی وجہ سے افراد اور اقوام اس بُری طرح جہنم کے عذاب میں گرفتار ہیں، اور اس کے ساتھ ہی افراد کی ذات کی نشوونما اس طرح ہوتی جائے کہ وہ موت کے بعد کی زندگی کی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائے۔ اگر ہمارا نظام اس قسم کے نتائج پیدا کرتا ہے تو وہ صحیح اسلامی ہے۔ اگر اس سے یہ نتائج مرتب نہیں ہوتے تو ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ اس میں کہیں خرابی ہے۔ اس خرابی (یا خرابیوں)، کا سراغ ہمیں قرآن کریم کی روشنی میں مل سکتا ہے۔
میری حقیر کوششوں سے مقصود یہ ہے کہ ہم ان خرابیوں کا ازالہ کر کے دین کے نظام کو انہی خطوط پر متشکل کر سکیں جن پر یہ حضور رسالتمآبؐ کے عہد مبارک میں استوار ہوا تھا۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

اتحاد پریس بل روڈ۔ لاہور

بصیرت افروز لٹریچر

نظام ربوبیت :- انسان کے لئے دنیا میں روٹی کا مسئلہ بڑا اہم ہے - اسکو سمجھنے کیلئے یہ کتاب پڑھیں قیمت مجلد چار روپے-

سلیم کے نام : جلد اول - ۸ روپے ، دوم ۶ روپے ، سوم ۶ روپے-

لغات القرآن : قرآن کریم کے ایک ایک لفظ کا مستند مفہوم چار جلدوں میں ، قیمت فی جلد پندرہ روپے لیکن جلد چہارم بارہ روپے-

جوئے نور :- اسمیں حضرت نوحؑ سے حضرت شعیبؑ تک کے سلسلۂ انبیاء کرام کا تذکرہ جلیلہ درج ہے قیمت مجلد -/۶ روپے

برق طور : اسمیں بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی عبرت انگیز داستان اور حضرت عیسیٰؑ سے قبل انبیائے بنی اسرائیل کا بصیرت افروز تذکرہ درج ہے - قیمت مجلد -/۶ روپے -

شعلۂ مستور : اسمیں حضرت زکریاؑ - حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا تذکار جلیلہ - قیمت مجلد -/۶ روپے -

انسان نے کیا سوچا : کائنات ، اخلاقیات ، سیاست ، معاشیات ، معشیت اور مذہب کے متعلق انسانی فکر کی نادر کہانی قیمت مجلد ۱۲ روپے -

الفتنة الکبریٰ : حضرت عثمانؓ کے زمانہ کی فتنہ - داستان (قیمت مجلد ۶ روپے) -

دھتکارے ہوئے انسان : قیمت ۵ روپے -

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

۲۷- بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

04
A
50.